مجازؔ

حیات اور شاعری

کتاب پبلشرز لکھنؤ

طبع اوّل سنہ ۱۹۶۷ء

قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

نظامی پریس لکھنؤ

انتساب

۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۵ء تک کے لکھنؤ کی ان ادبی صحبتوں
اور کافی ہاؤس کی شاموں کی یاد میں جن کا دماغ
آل احمد سرور اور دل اسرار الحق مجاز تھے۔

منظر سلیم

مصنّف کی دوسری کتابیں

لب و رخسار آغوش نمائش خلش چشمِ نم پھولوں کے انبار	ناول

مجاز اور حقیقت

مجاز کی زندگی اور شاعری پر منظر سلیم کا یہ طویل مقالہ جدید تنقیدی سرمایہ میں ایک خوشگوار اور اہم اضافہ ہے۔ یہ پہلی تصنیف ہے جس میں اردو کے اس محبوب اور ممتاز شاعر کے عہد کی ادبی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی فضا کے پس منظر میں اسکے ذہنی و فکری ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ شاعری کے ارتقائی مراحل کی نشان دہی کی گئی ہے فنی و ہیئتی پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اہم رجحانات سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں ہم عصروں کے کارناموں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ادبی مرتبہ متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے تجزیہ، تبصرہ اور تنقید کا یہ سارا کام منظر سلیم نے علاحدہ علاحدہ ابواب قائم کر کے جس بھرپور سائنٹفک انداز میں انجام دیا ہے اس انداز میں نہ صرف یہ کہ مجاز پر اس سے قبل کچھ نہیں لکھا گیا تھا بلکہ جوش اور فیض سمیت کسی بھی جدید شاعر پر اب تک اس تفصیل کے ساتھ اور ایسے بھرپور انداز میں کچھ نہیں لکھا جا سکا۔

منظر سلیم کے اس کارنامے کی وقعت اس حقیقت کے مدنظر کچھ اور بڑھ جاتی ہے کہ

انھوں نے مجاز سے اپنی قربت اور گہرے لگاؤ کو نقاد کے فرائض کی انجام دہی کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ وہ آٹھ نو سال مجاز سے بہت قریب رہے ہیں اور انکی شاعری پر اظہار خیال کرتے وقت عقیدت کے جذبات ان پر غالب آجاتے تو زیادہ حیرت کی بات نہ ہوتی لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ فنی یا فکری حیثیت سے جہاں کہیں انھیں مجاز کی شاعری پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے انھوں نے اس سے گریز نہیں کیا یہاں تک کہ غزلوں کے علاحدہ تجزیہ کی ضرورت کو انھوں نے محض اس لئے رسمی تصور کر کے نظر انداز کر دیا ہے کہ ان کے خیال میں مجاز کی شاعری کا سب سے جاندار حصہ نظموں پر مشتمل ہے غزلوں پر نہیں۔

فکر و فن سے متعلق یوں تو پورا حصہ نہایت ہی خیال افروز ہے لیکن مجاز کے تصور انقلاب کے سلسلے میں جو بحث کی گئی ہے وہ خاص طور سے قابل ستائش ہے مجاز نے اپنی مشہور نظم " انقلاب " میں انقلاب کے جن مختلف مراحل پر زور دیا تھا ان کی نشان دہی اس سے قبل کسی نے نہیں کی تھی۔ اس بحث کے بعد محسوس ہوتا ہو کہ مجاز پہلے شاعر تھے جنھوں نے اردو شاعری کو انقلاب کا ایک جاندار اور صحت مند تصور عطا کیا نیز یہ کہ اس معاملے میں ان کے جوش کے متاثر ہونے یا ان کے تصور انقلاب کے " محض تخریب پر منتج ہونے " سے متعلق تمام اعتراضات بہت ہی بے جان اور سطحی نوعیت کے ہیں۔

کتاب کا ابتدائی حصہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے یہ پہلا موقع ہے جب مختلف مضامین کے مطالعہ اور مجاز کے عزیزوں اور دوستوں سے بات چیت کے ذریعے معلومات یکجا کر کے ان حالات زندگی مربوط شکل میں پیش ہو رہے ہیں۔ مجاز کی

شخصیت سے متعلق حصے خصوصاً بہت جاندار ہیں گھر کے ماحول، کافی ہاؤس کی شاموں
بادہ و جام کی نشستوں اور مشاعروں کی راتوں کے پس منظر میں مجاز کی یہ جیتی جاگتی تصویر
کوئی ایسا ہی شخص پیش کر سکتا تھا جس نے اس شاعر شہر نگار ان کی زندگی کے
ان مختلف پہلوؤں کو زیادہ دنوں تک قریب سے دیکھا ہو۔ منظر سلیم نے یہ حق
بڑی کامیابی سے ادا کیا ہے اور اس طرح "مجاز۔ حیات اور شاعری" مجاز پر
سب سے عمدہ کتاب بن گئی ہے۔

عابد سہیل

۱۷ اگست ۶۷ء

پہلا حصہ: حالات زندگی اور شخصیت

خاندانی پس منظر

ماحول

بچپن

آگرہ میں طالب علمی کا زمانہ

علی گڑھ میں

ریڈیو کی ملازمت اور معاشقہ

لکھنؤ کو واپسی اور "نیا ادب" کا حلقہ

ہارڈنگ لائبریری کی ملازمت

جنون کا دوسرا حملہ اور اس کے بعد

سفر پاکستان

جنون کا تیسرا دورہ

شام غریباں لکھنؤ

مجاز کی شخصیت

دوسرا حصّہ : فکر و فن

(۱) مجاز کی شاعری کا ارتقا

ذہنی و فکری ارتقا

ہئیتی و فنی شعور

(۲) مجاز ۔ شباب اور انقلاب کے شاعر

(۱) تصورِ عشق

(۲) تصورِ انقلاب

(۳) مجاز کا ادبی مرتبہ

اور

مجاز کی منتخب نظمیں

بارہ بنکی[1] کے مشہور قصبہ ردولی کے خواجہ جال محلے میں سڑک سے دور ہٹ کر ایک بہت بڑا ٹوٹا پھوٹا سا مکان ویران و سنسان کھڑا ہے اب اس میں کوئی نہیں رہتا لیکن نوابی عہد میں جن دنوں یہ سہ منزلہ عمارت تعمیر ہوئی تھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس زمانے میں یہ قصبے کی سب سے بڑی عمارت تصور کی جاتی تھی اور اس میں چودھریوں کا ایک معزز گھرانا آباد تھا۔ چودھری احمد حسین مرحوم جو اپنی سوجھ بوجھ اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے قصبہ بھر میں مشہور تھے اسی قدیم خاندان کے ایک متوسط درجہ کے زمیندار تھے۔ ان کے سات اولادیں تھیں چار بیٹے اور تین بیٹیاں۔ بیٹوں کے نام تھے چودھری نعمت رسول۔ چودھری رحمت رسول چودھری عین الحق

---

[1] خاندان سے متعلق معلومات اسرار الحق مجاز کے ایک قریبی عزیز مسٹر فرید الحق سے حاصل کی ہیں جو سنٹرل سنی وقف بورڈ لکھنؤ میں ایک ذمہ دار عہدے پر مامور ہیں۔

اور چودھری سراج الحق۔

چودھری سراج الحق ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ انھیں تعلیم
حاصل کرنے کا بہت شوق تھا چودہ برس کے تھے کہ ان کی شادی چچا زاد
بہن سے کر دی گئی لیکن ان کا حصول تعلیم کا شوق برقرار رہا اور زیادہ تر
ذاتی لگن اور محنت کی بدولت انھوں نے میٹرک پاس کر لیا۔ چودھری احمد حسین
نے بیٹے کے شوق کو دیکھ کر انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ بھیج دیا۔ وہ ان کے
ماہانہ مصارف کے سلسلے میں پندرہ روپے بھیجا کرتے تھے جو اس زمانہ میں ان
کے مصارف کے لیے کافی ہوتے تھے۔ انھوں نے لکھنؤ سے بی اے ایل ایل بی کیا
اور جس طرح وہ قصبہ کے پہلے گریجویٹ تھے اسی طرح خاندان کے پہلے فرد تھے جس
نے زمینداری کے بجائے سرکاری ملازمت کو ذریعہ معاش بنایا۔

چودھری سراج الحق تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ روز کوئنس
کالج لکھنؤ میں لیکچرر رہے پھر محکمہ رجسٹریشن لکھنؤ میں ہیڈ کلرک ہو گئے اس کے بعد
سنہ ۱۹۲۹ء کے لگ بھگ وہ اسی شعبہ میں انسپکٹر رجسٹریشن کے عہدہ پر مامور ہوئے
اور انھیں مغربی حلقہ ملا جس کا صدر مقام آگرہ تھا۔ کچھ عرصہ آگرہ میں
رہے پھر علی گڑھ کو تبادلہ ہو گیا اور ملازمت کے آخری دنوں تک علی گڑھ
ہی میں رہے۔ وہیں سے سنہ ۳۵ء میں رٹائر ہوئے اور لکھنؤ واپس ہو کر نیو
حیدرآباد میں کرائے کے ایک مکان میں قیام کیا۔ تین چار سال بعد غالباً
سنہ ۳۵ء میں نیو حیدرآباد ہی میں ایک مکان خرید لیا جسے ایک بنگالی نے
جو سکریٹریٹ میں ملازم تھے سنہ ۱۹۳۶ء میں بنوایا تھا۔ خریداری کے بعد انھوں

نے اس کا نام دارالسراج[1] رکھا اور اسی مکان میں چند سال قبل ان کا انتقال ہوا۔

چودھری سراج الحق کی ۵ اولادیں زندہ رہیں اسرارالحق مجازؔ جن کا ۵۵ء میں انتقال ہوا۔ انصارالحق (انصار ہروانی جو چوتھے عام انتخابات سے قبل تک کانگریسی ممبر پارلیمنٹ تھے اور ان دنوں دہلی میں مقیم ہیں) عارفہ خاتون جن کا ۵۱ء میں انتقال ہوا۔ صفیہ خاتون جو اردو شاعر جاں نثار اختر کو بیاہی تھیں اور جن کا ۵۳ء میں انتقال ہوا۔ اور حمیدہ خاتون جو ڈاکٹر ابوسالم کو بیاہی ہیں اور آج کل دہلی میں مقیم ہیں

چودھری احمد حسین کے انتقال کے بعد ان کی جائیداد چاروں بیٹوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور چاروں کو علیحدہ علیحدہ جو آراضی اور باغات وغیرہ ملے تھے ان کی مالیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چودھری سراج الحق اس زمانے میں ۶۰۰ روپیہ سالانہ کے مال گزار تھے اور جائیداد سے انھیں تین ہزار روپیہ سالانہ سے زائد کی آمدنی تھی اس کے علاوہ اور بہت سی سہولتیں حاصل تھیں۔ یہ تمام آراضی کاشتکاروں کے پاس لگان پر اٹھی ہوئی تھی اور خاتمہ زمینداری کے بعد قبضہ سے نکل گئی۔ اب اس خاندان کی کوئی آراضی قصبے میں نہیں ہے۔

---

[1] یہی وہ مکان ہے جسے مجازؔ کی مستقل سکونت کے باعث شہرت ملی۔

چودھری سراج الحق اپنی شادی کے کچھ عرصہ بعد خسر کے انتقال پر خواجہ ہال والے آبائی مکان سے سسرال کے مکان کو منتقل ہو گئے تھے جو محلہ نبی خاں میں واقع تھا۔ یہیں مجاز اور دوسرے بچے پیدا ہوئے۔ اس مکان کا زنانہ حصہ فروخت کر دیا گیا ہے اور اب اس میں ایک زنانہ اسکول قائم ہے۔ مردانے حصے کی کچھ آراضی سڑک پر تھی جس پر چند دوکانیں بنوائی گئی تھیں جو مجاز کی یاد میں مخدومیہ اسکول ردولی کے نام وقف کر دی گئیں اور اس طرح اس خاندان کے باقی لوگوں کا ردولی سے کوئی سلسلہ باقی نہیں رہ گیا۔

ماحول

مجازؔ نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو ردولی کے جس ماحول میں آنکھ کھولی
اس پر جاگیردارانہ نظام کی گہری چھاپ تھی۔ نصف صدی قبل کی ردولی آج
کی ردولی سے بہت مختلف تھی۔ چودھریوں کے گھرانے سب کے سب زمیندار
اور تعلقداروں پر مشتمل تھے جن کی زمینداریاں اور تعلقے قریبی دیہی علاقو
میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کارندے دیہی علاقوں سے رقمیں وصول
کرکے لاتے اور کاغذی اینٹوں کی موٹی موٹی دیواروں اور چوڑے چوڑے
بھاری پھاٹکوں والے محل نما مکانات کے اندر دولت کی فراوانی عیش و
عشرت کے سامان فراہم کرتی۔ قصبہ کی زیادہ تر آبادی کسی نہ کسی حیثیت سے
انھیں زمینداروں اور تعلقداروں کے عام نظام زندگی کی رہینِ منت تھی۔
تمام مذہبی رسوم اور شادی غمی کی تمام تقریبات بڑی دھوم دھام سے منائی
جاتیں اور یہ دھوم دھام قصبے کی عام زندگی پر اثر انداز ہوتی۔ معاشی خوش
حالی اور زمیندارانہ جاہ و جلال، نفاست، خوش سلیقگی، خوش مزاجی،

وضعداری، آن بان اور عیش وعشرت کے نئے طریقوں کو جنم دیتا اور لوگ ملک کی عام فضا سے بے خبر اپنی اس چھوٹی سی جنت میں بے فکری کی زندگی بسر کرتے۔

ردولی کے چودھریوں کی زندگی مجاز کے بچپن میں کس ٹھاٹھ باٹھ سے گزرتی ہوگی اس کا اندازہ چودھری محمد علی ردولوی کے خاکہ سے ہوتا ہے جوان کی صاحبزادی بیگم اخلاق نے چودھری صاحب کی زندگی ہی میں لکھا تھا۔ انھوں نے بہت محتاط رویہ اختیار کیا ہے پھر بھی اس خاکے میں چودھری صاحب کی حسن پرستی کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔ بیگم اخلاق نے چودھری محمد علی ردولوی کی جوانی کا جو مجاز کے بچپن کا زمانہ تھا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"جوانی میں پھولوں کا، عمدہ کپڑوں کا، بہترین عطر کا بڑا شوق رہا۔ جامہوار جامدانی کی شیروانی اور انگرکھے پہنتے تھے۔ مشک اور اگر وغیرہ کے سب سے قیمتی عطر استعمال کرتے تھے۔ بیلے چنبیلی کے پھولوں کا پورا بستر لگتا تھا جس پر آرام فرماتے تھے حقہ ایسا پیتے تھے کہ اس کا مثل دوسرا شاید ہی کہیں دکھائی دے۔ خود ردولی میں نیچے بند کو سمجھا کر تیلی نے کے بڑے سبک اور خوبصورت نیچے بنواتے تھے۔ لکھنؤ وغیرہ میں دوستوں کو بھی بھیجا کرتے تھے۔ چاندی کا چنبر، نیچے چاندی کی تھالی جس میں رنگ برنگ کے پھول نفاست سے رکھے ہوئے اور چاندی ہی کا حقہ، بیلے کے پھولوں کا ہار نے میں لپٹا ہوا عجیب بہار دکھاتا تھا۔"[1]

---

[1] نقوش شخصیات نمبر ۵۵ ص۶

مجاز کو بچپن میں عیش و عشرت کا ایسا شاندار ماحول نہیں ملا کیونکہ ان کا گھرانا چودھری محمد علی ردولوی جیسے بڑے تعلقداروں کا گھرانا نہ تھا بلکہ یہ متوسط درجہ کے زمینداروں کا گھرانا تھا لیکن خوش حالی اور معاشی بے فکری کی خود ان کے اپنے یہاں بھی کمی نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے عزیز و اقارب[1] اور دوسرے زمینداروں کے یہاں اس قسم کی زندگی کے نقشے یقیناً بہت قریب سے دیکھے ہوں گے اور اس جاگیردارانہ ماحول سے ان کے ذہن نے یقیناً بعض اثرات قبول کئے ہوں گے۔ یہ اثرات اور یہ ماحول ان کی شخصیت کے ارتقا کے سلسلے میں بہت اہم ثابت ہوا۔ ان کے یہاں حسن پرستی کا جو رجحان آخر تک قائم رہا اور "بستر اطلس و کمخواب ہے دنیا میری" کا تصور اور مزاج میں سرکشی اور بانکپن کے عناصر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت کچھ اس ماحول کی دین تھے۔

ردولی کے اس ماحول سے ان کے متاثر ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ترقی پسندی اور اشتراکیت سے اپنی جذباتی وابستگی کے باوجود اپنے اس ماضی کو جو اس نظام حیات کی نفی کرتا تھا جس کے وہ تمام زندگی خواب دیکھتے رہے تلخ حقیقت کی طرح فراموش نہیں کیا۔ انھیں زمینداروں کی اس ردولی کے زوال کا بہت دکھ تھا۔

اس خود فراموشی کے عالم میں بھی اماں جب کبھی ان کے بچپن کی ردولی کا ذکر چھیڑتیں تو وہ بہت دل چسپی سے اس میں حصہ

---

[1] فریدالحق صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ چودھری محمد علی بھی ان لوگوں کے دور کے عزیز تھے

لیتے ہر چھوٹے بڑے کو پوچھتے اب سے آٹھ دس سال پہلے تک
وہ اکثر ردولی جایا کرتے تھے مگر اب باوجود اصرار کے بھی
وہاں نہیں جاتے تھے۔ انھیں اپنے وطن کے زوال پر بہت دکھ تھا[۱]

مجاز کی خوش قسمتی تھی کہ ان کا گھرانا اپنے طبقہ کے قدیم روایات
کو عزیز رکھنے کے ساتھ ہی انگریزی تعلیم کی لائی ہوئی نئی قدروں کو بھی لبیک
کہہ رہا تھا۔ ان کے دادا نے ان کے والد کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور ان کے والد نے
سرکاری ملازمت اختیار کی حالانکہ سماجی اعتبار سے ان کے لئے سرکاری ملازمت کرنی کوئی
برائی نہ تھی بہرحال اس طرح زمیندارانہ تہذیب میں جن نئی قدروں کا اضافہ ہوا انھوں نے مجاز کے لئے باقا
کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور ردولی کی محدود فضا سے نکل کر
دوسرے شہروں کے ماحول سے متاثر ہونے کے دروازے کھول دیئے۔

۱؎ جگن بھیا (مجاز) از بیگم حمیدہ سالم

بچپن

مجاز کھاتے پیتے خوش حال زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ ان کا بچپن بڑے لاڈ پیار میں گزرا۔ پھر ایک جذباتی عنصر کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ ان سے بڑا ایک بچہ دو ڈھائی سال کا ہو کر انتقال کر گیا تھا اس لئے مجاز پیدا ہوئے تو ان پر خاص طور سے توجہ دی گئی اور وہ منتوں مرادوں میں پالے گئے۔

ان کے والد، والدہ اور بڑی بہن (عارفہ خاتون) کا انتقال ہو چکا ہے اس لئے ان کے بچپن سے متعلق جو باتیں بھی معلوم ہو سکیں وہ ان کی چھوٹی بہن حمیدہ سالم کے مضمون "جگن بھیا" ہی سے معلوم ہو سکیں وہ خود مجاز سے بہت چھوٹی ہیں اور ان کی بچپن کی باتوں کا انھیں ظاہر ہے کہ اپنے والدین ہی کے ذریعے علم ہوا ہوگا اس لئے انھیں مستند تصور کرتا ہوگا

۱؎ اس مضمون کی اشاعت کے وقت مجاز کے والدین حیات تھے

بلیک پائنٹ

بیگم حمیدہ سالم کا کہنا ہے کہ

"محرم کی ساتویں کو فقیر بنتے، دسویں کو مالک بنائے جاتے۔ ایک کان میں بندا پڑا ہوا تھا جو ۶ سال کی عمر میں اجمیر لے جاکر اتار دیا گیا۔ ہر دکھ بیماری پر صدقے اترتے، خیراتیں ہوتیں نو دس سال کے تھے کہ اٹھارہ سالہ بڑے بھائی کا درخت سے گر کر انتقال ہوگیا پھر کیا تھا ماں اور نانی دیوانہ وار ان کو تمام حوادث و خطرات سے بچانے کی ہر ممکن کوشش میں لگ گئیں مجال نہ تھی کہ گھر سے باہر اکیلے قدم نکالیں۔ ہر وقت ایک نوکر ان کے ساتھ رہتا تھا۔" لہ

بچپن میں مجاز کو رات کو جاگنے کی عادت تھی ماں ان کی پرورش کے سلسلے میں رات رات بھر جاگ کر کاٹتی ان کے راتوں کو جاگنے کی اسی عادت کی بنا پر ان کی عرفیت جگن قرار پائی تھی۔

بیگم حمیدہ سالم کے مضمون کے اس حصہ سے جو مجاز کے بچپن سے متعلق ہے۔ ایک شریر بچے کی تصویر ابھرتی ہے جو بھائی بہنوں سے لڑنے جھگڑنے اور ماں سے ہمیشہ اپنے حق میں فیصلہ کرانے کا عادی تھا، جس کے مشغلے کھلونوں کو توڑنا، دوسروں کے حصے کی مٹھائی چھپ کر کھالینا اور گلی ڈنڈا کھیلنا تھے۔ اور جو بچپن ہی سے حسن سے بڑا گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔ وہ لکھتی ہیں:-

---

لہ مجاز ایک آہنگ، مرتبہ صہبا لکھنوی

"کوئی خوبصورت بیوی دیکھ لیتے بس دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گھنٹوں ان کے پاس بیٹھے رہتے۔ کھیل کود کھانے پینے کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ میری پیدائش کے وقت لکھنؤ سے ایک خوبصورت دلہن بیاہ کر رودولی آئی تھیں ان کے پیچھے جگن بھیا کا دیوانگی کا عالم تھا۔ میرا نام ذکیہ رکھا گیا تھا ضد کر کے بدلا اور (ان خاتون کے نام پر) حمیدہ رکھ دیا۔ جانے محض چاہت میں یا اس امید پر کہ شاید نام ہی کی لاج رکھ کر میں خوبصورت نکل جاؤں بڑھ کر۔"

مجاز کی ابتدائی تعلیم رودولی کے ایک مکتب میں ہوئی اس کے بعد لکھنؤ آ گئے جہاں ان کے والد چودھری سراج الحق محکمہ رجسٹریشن میں ہیڈ کلرک تھے۔ فرید الحق صاحب نے بتایا کہ پہلے یہ خاندان گولہ گنج میں منشی احترام علی کاکوروی کی زنانی کوٹھی کے سامنے والے مکان میں رہتا تھا بعد میں کرایہ کے ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گیا جو ڈاکٹر ٹی بہادر والی گلی میں کچے احاطہ میں واقع تھا۔ یہیں سے مجاز نے امین آباد ہائی اسکول (اب انٹر کالج) سے ہائی اسکول پاس کیا۔

امین آباد ہائی اسکول میں طالب علمی کے زمانے میں ان کے خارکا کے ہیجران کے بعد کے قریبی دوست فرحت اللہ انصاری کے والد تھے۔ انھیں اس زمانے میں کھیل کود سے گہری دلچسپی تھی۔ جیسا کہ بیگم حمیدہ سالم کے مضمون سے پتہ چلتا ہے :-

"پڑھائی میں ہوشیار اور حساب میں خاص طور سے بہت تیز تھے۔ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ کھیل کود کی وجہ سے گھٹنے ہمیشہ زخمی رہتے اور ماں بے چاری نئے نئے پاجاموں میں پیوند لگاتے لگاتے اور رفو کرتے کرتے عاجز تھیں۔ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کی ہر وقت مشق ہوتی رہتی تھی۔ گھر کے نہ جانے کتنے پلنگ ان کی اس مشق کی نذر ہوتے رہے ہوں گے۔ پلنگ کھڑے کرکے ان کے اوپر سے کودتے تھے۔" [1]

فرحت اللہ انصاری فرنگی محلی کا کہنا ہے[2] کہ لکھنؤ ہی میں معین احسن جذبی سے جو اس زمانے میں کرسچین کالج میں پڑھتے تھے مجاز کی دوستی ہوگئی تھی اور جذبی کے مشورے سے انھوں نے لکھنؤ ہی میں شاعری شروع کردی تھی لیکن اس کی خود جذبی صاحب یا کسی اور شخص سے تصدیق نہیں ہوسکی۔

---

[1] جگن بھیا ۔ از بیگم حمیدہ سالم

[2] مجاز ۔ چند یادیں ۔ از فرحت اللہ انصاری

آگرہ میں طالب علمی کا زمانہ

تقریباً ۱۸ سال کی عمر میں مجاز آگرہ گئے۔ اس وقت انھوں نے امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ سے میٹرک پاس کیا تھا اور والد کا تبادلہ آگرہ ہو جانے کی وجہ سے ان کی مزید تعلیم کے لئے آگرہ ہی کا انتخاب کیا گیا تھا۔ آگرہ میں انھوں نے سنہ ۱۹۲۹ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کے قیام کی قطعی تاریخیں معلوم نہیں ہو سکیں لیکن چونکہ سنہ ۲۹ء میں انھوں نے انٹر میں داخلہ لیا تھا اور انٹر فائنل کے امتحان تک ان کا آگرہ میں یقیناً قیام رہا اس لئے خیال ہوتا ہے کہ سنہ ۳۰-۲۹ء اور سنہ ۳۱-۳۰ء دو تعلیمی سال انھوں نے آگرہ میں گزارے اور غالباً انٹر کے امتحانات کے بعد وہ علی گڑھ چلے گئے جہاں گھر کے دوسرے افراد سنہ ۱۹۳۰ء ہی میں پہونچ چکے تھے۔

آگرہ کا قیام ان کی ادبی زندگی کے لئے بہت اہم ثابت ہوا۔ یہاں وہ فانی بدایونی مرحوم کے پڑوس میں رہتے تھے اور کالج میں معین احسن جذبی ان

کے کلاس فیلو تھے۔ آل احمد سرور بھی اس زمانے میں اسی کالج میں زیر تعلیم تھے اور مجاز اور جذبی سے ایک سال سینیر تھے۔ اس کے ساتھ ہی میکش اکبرآبادی سے بھی قریبی مراسم قائم ہو گئے تھے۔ حامد حسین قادری مرحوم نے وہاں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کر رکھی تھی۔ اس ادبی ماحول سے مجاز نے دھیرے دھیرے اثر قبول کرنا شروع کیا اور شعر و شاعری سے ان کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ جذبی کا تخلص اس زمانے میں ملال تھا اور مجاز کا شہید اور دونوں کالج کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ ایک بار کالج ہی کے ایک مشاعرے میں جس کے لیے آل احمد سرور اور جذبی نے بھی غزلیں لکھی تھیں مجاز کو بہترین غزل پر گولڈ میڈل ملا۔ اس واقعے کا مجاز ۱۹۵۲ء میں اپنے جنون کے زمانے میں بڑے ولولے کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے اس غزل کا مطلع یہ تھا۔

یونہی بیٹھے رہو بس درد دل سے بے خبر ہو کر
بنو کیوں چارہ گر تم کیا کرو گے چارہ گر ہو کر

میکش اکبرآبادی سے مجاز کی ملاقات جذبی کے ذریعے ہوئی تھی میکش اکبرآبادی نے اس زمانے کے مجاز کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"کچھ روز بعد جذبی صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب ملے، دبلے پتلے منحنی سے۔ لباس اور وضع بہت سجلی اور درست مگر مجبوری یہ تھی کہ گال پچکے ہوئے اور جوانی کی بھی کوئی کشش ان میں نہ تھی۔ یہ مجاز صاحب

تھے۔ شعر بھی معمولی سا کہتے تھے اور پڑھنا بھی خدا کا نام تھا۔ بولتے بھی بہت نہ تھے اور چہرے سے بھی دل کی آگ کا پتہ نہ چلتا تھا ہاں آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی وہ ایسے ملتے تھے جیسے کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو۔ تقریباً ہر روز شام کو خدیجی صاحب کے ساتھ آتے۔ گپیں لگتیں ہنستے ہنساتے اور چلے جاتے۔ کبھی کبھی شعر و شاعری بھی ہو جاتی مگر صحبت کا اصل موضوع تو ہنسنا ہنسانا اور بنا بنانا ہی تھا۔ شام کی صحبت میں یہی کام سنجیدگی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ شام کی اس مجلس کا دن بھر انتظار رہتا جہاں نہ سوچ کر بات کی جاتی تھی اور نہ بات کرنے کے لئے سوچنا پڑتا تھا مگر مجاز تو اس وقت بھی ایسے ہی معلوم ہوتے تھے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ ان کی فطرت عجیب تھی۔ ان کی بے تکلفی، ان کے مذاق اور ان کی ہنسی سب کی ایک حد تھی معلوم نہیں سب کے ساتھ وہ ایسے تھے یا میرے ہی ساتھ یہ معاملہ تھا۔[۱]

میکش اکبرآبادی کے ذریعے مجاز کو فانی مرحوم کی صحبت بھی میسر ہوئی۔ اور ان سے انھوں نے چند غزلوں پر اصلاح بھی لی۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں جب لکھنؤ میں ان پر جنوں کے تیسرے اور آخری حملے کا آغاز تھا انھوں نے خود فانی مرحوم سے اپنے اصلاح لینے کی تفصیلات ایک نشست میں بیان کی تھیں جنھیں ڈاکٹر محمد حسن نے اسی زمانے میں اپنی ڈائری کے صفحات میں محفوظ

---

[۱] علی گڑھ میگزین مجاز نمبر

کر لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن کی ڈائری کا متعلقہ حصہ حسب ذیل ہے۔

"فانی کے بارے میں بہت سے قصے سنائے، پہلی بار جب اصلاح لینے گئے تو فانی صاحب میکش صاحب کے یہاں آگرہ میں تھے۔ میکش صاحب کے مکان کے دونوں طرف طوائفیں رہتی ہیں اور بیچوں بیچ میں میکش صاحب کا مکان ہے۔ پہلی غزل ڈرتے ڈرتے انھوں نے سنائی فانی نے میکش صاحب کو مخاطب کر کے کہا "میاں میکش اس لڑکے نے یہ غزل کہی ہے"۔

اس کے بعد ایک غزل پر ایک مصرعہ کی اصلاح کی اور ایک شعر پر دو بار صاد بنا دیا اصلاح یہ تھی۔ مجاز کا شعر تھا۔

قتل کر کے وہ مستیاں ان کی
خون دل بھی شراب ہوتا تھا

فانی نے پہلا مصرعہ یوں بدل دیا۔

ہجر میں کیف اضطراب نہ پوچھ
خون دل بھی شراب ہوتا تھا

مجاز نے ہر بار اسے بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارا لونڈا پن دیکھئے لکھنوی انداز کا شعر کہا تھا۔ جس پر دو صاد بنا دیے تھے وہ شعر یہ تھا۔

ان کے جلووں میں گھر گیا آخر
ذرہ کو آفتاب ہونا تھا

اس کے بعد تیسری بار اپنے زعم میں غالب سے بھی زیادہ اچھی غزل لکھ کر ان کے پاس لے گئے، انھوں نے ایک نظر دیکھی اور کہا کل آنا" ہم سمجھے تھے کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے دوسرے دن گئے تو مطلع پڑھا۔

یوں مسکرائے رخ سے اٹھا کر نقاب کو
کچھ بجلیوں نے گھیر لیا آفتاب کو

کہنے لگے "سہل شعر ہے، حضرت آپ برسوں کی راہ ایک دن میں طے کرنا چاہتے ہیں"۔ پھر کہا "تبسم لب پہ ہوتا ہے کہ چہرے کے چاروں طرف ہے"؟

"اس غزل کی اصلاح کے بعد ہم کمرے میں جا کر ایک گھنٹہ کے قریب خوب روئے اور فانی صاحب پر سخت خفا ہوئے

• ان کی غزل پر غزل لکھی راہ میں ملے تو طنز نے انھیں خوب جھک جھک کر سلام کیا، سامنے سے گزر رہے تھے مجاز کا مکان راہ میں تھا سلام کیا تو وہیں رک گئے مجاز نے وہی غزل جو ان کی غزل پر لکھی تھی سنائی۔ بالکل خاموش بیٹھے رہے غزل ختم ہو گئی تو کہنے لگے "میاں مجاز اس غزل کو ایک بار پھر پڑھنا" مجاز نے کہا "یہ گویا میرے لئے سب سے بڑی داد تحسین تھی۔ یہ غزل فانی کی غزل "تا لے ہوئے تو ہیں" "سنبھالے ہوئے تو ہیں" پر لکھی تھی اور "آہنگ" میں شامل ہے اس کا مطلع ہے۔

سینے میں ان کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں

آخری غزل جو مجاز نے فانی کو دکھائی تھی اس پر فانی نے کہا "میاں تمھاری غزلوں میں نشاط کا رنگ ہے میرا غم تمھاری جوانی اور نشاط کو روند ڈالے گا اس لئے آیندہ مجھ سے اصلاح نہ لیا کرو۔ صرف الفاظ اور ترکیبوں کا اشتباہ دور کر لیا کرو یا ایک آدھ مصرعہ سنا دیا کرو" [1]

۱۹۳۰ء میں گھر کے لوگ آگرہ سے علی گڑھ آ گئے۔ اور مجاز کالج کے بورڈنگ میں مقیم ہو گئے۔ ان کے لئے یہ زندگی کا پہلا موقع تھا جب انھیں خاندان کے لاڈ پیار سے الگ ہو کر اکیلے رہنا پڑا۔ اور جیسا کہ بیگم حمیدہ سالم نے لکھا ہے "یہاں سے ان کی زندگی کا پہلا موڑ شروع ہوا وہ خود بھی اس موڑ پر کچھ دقفہ حیران پریشان ٹھٹھک کر رہ گئے۔ پڑھائی میں ابتری شروع ہوئی۔ زندگی کا نظام درہم ہونے لگا" [2]

دراصل یہی وہ زمانہ تھا جب مجاز کی زندگی ان کے اس مشہور فقرے کی زبان میں جو وہ اپنی نظموں کے کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی لائن کے عین مطابق نہ ہونے پر اعتراضات کے جواب میں طنزیہ انداز میں کہا کرتے تھے۔ "ذرا پٹری سے اتر گئی تھی۔"

---

[1] کالونی مجاز سے متعلق ڈائری کے اقتباسات "نقوش" ۵۵-۵۶
[2] جگن بھیا

مزاج میں حسن پرستی بچپن سے شامل تھی ۔ فانی جیسے استاد فن سے چھیڑ چھاڑ کرنے والی سرکشی بھی پیدا ہو چلی تھی ۔ دوست احباب بھی ہم مزاج ہی تھے ۔ آغاز شباب کے دن تھے ۔ بورڈنگ میں قیام تھا گھر کے لوگ علی گڑھ جا چکے تھے بندشوں سے پہلی بار چھٹکارا ملا تھا اور کوئی ٹوکنے والا سارے شہر میں موجود نہ تھا ان حالات میں وہ کچھ بہک گئے ہوں، زندگی میں بے اعتدالیاں پیدا ہو گئی ہوں تو تعجب کی بات نہیں اس خیال کو دو باتوں سے تقویت بھی پہونچتی ہے ۔ ایک تو وہ لطیفہ ہے جسے خود انھوں نے ۱۹۵۲ء میں بیان کیا تھا ۔

(مجاز) "اپنے ایک اور ہم جماعت کا ذکر کرنے لگے جو بے حد شریر تھا ۔ ایک عیسائی لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا کسی نے بتایا کہ اس کو رام کرنے کے لئے الو کا دل کھلاؤ ۔ لہذا جاڑے کی راتوں میں راتّے رات بھر غلیل لئے سڑکوں پر الو مارتے پھرتے تھے ۔ آخر ایک دن ۴ بجے صبح کو الو ہاتھ آیا اور اس کا دل نکال کر کیک میں رکھ کر اس لڑکی کو لے جا کر کھلایا مگر وہ پھر بھی مہربان نہ ہوئی" [۱]

دوسری بات میکش اکبرآبادی کے مضمون میں ملتی ہے ۔

"مجاز کی اور میری ملاقات اور محبتوں میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کا افسانہ بنایا جا سکے ہاں ان کی زندگی میں کچھ راز ضرور تھے کیوں کہ

---

[۱] ڈاکٹر محمد حسن کی ڈائری کے اوراق ۔ نقوش ۵۶-۵۵ء

جب وہ شام کو ہوسٹل سے شہر آنے کو ہوتے تو آدھ گھنٹے آئینے کے سامنے سنورتے رہتے۔ یوں تو شاید ہر آدمی کسی نہ کسی پہلو سے اپنے آپ کو اچھا لگتا ہے اور جتنا اچھا لگتا ہے اس سے زیادہ اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے خصوصاً جب وہ کسی کی نظر میں محبوب بننا چاہتا ہو یہ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ وہ کس کی نظر میں محبوب بننا چاہتے تھے۔ البتہ ایک روز ایسا ضرور ہوا کہ وہ شام کو حسب معمول میرے یہاں آئے اور ہم سب کی طرف پشت کر کے ایک مکان کی طرف منھ کر کے بیٹھ گئے مجھے یہ بات خصوصیت سے بری لگی کیوں کہ اس وقت کچھ ایسے لوگ بھی بیٹھے تھے جن کی میں عزت کرتا تھا۔" لہ

ڈاکٹر محمد حسن کے اس بیان کو کہ "میکش صاحب کے مکان کے دونوں طرف طوائفیں رہتی ہیں" ذہن میں رکھا جائے تو اس قصے سے ایک افسانہ تو بن ہی جاتا ہے لیکن نہ میکش اکبرآبادی نے اسے کوئی خاص اہمیت دی ہے اور نہ ہی جذبی نے اس سلسلے میں کچھ لکھا ہے جن کو اس قصے کا بہرحال علم رہا ہوگا اس لئے خیال ہوتا ہے کہ بات اس سے آگے نہ بڑھی ہوگی پھر بھی دوست کی محبوبہ کو رام کرنے کے لئے جاڑے میں رات رات بھر سڑکوں پر غلیل لئے الو مارنے کے لئے گھومتے رہتے اور بعض ایسے لوگوں کی موجودگی میں جن کی

لہ علی گڑھ میگزین مجاز نمبر

میکش اکبرآبادی بہت عزت کرتے تھے کسی کو دیکھنے کے لئے ان سب کی
طرف پشت کرکے بیٹھ جانے کے واقعہ سے کم از کم یہ اندازہ تو ضرور ہوتا ہے
کہ مجاز نے آغاز شباب کے اس ہنگامی زمانے میں پہلی بار گھر کے دوسرے لوگوں
سے الگ ہوئے تو ان کے گھرانے کی بعض صحت مند روایات کا دامن بھی ان کے
ہاتھوں سے چھوٹ چلا۔ اس طرح آگرہ کے قیام کا زمانہ ان کی زندگی کے لئے
ان معنوں میں اہمیت رکھتا ہے کہ یہیں سے "زندگی کا نظام درہم برہم ہونا
شروع ہوا۔

"امتحان میں فیل ہوئے۔ خود بتاتے تھے کہ امتحان کی کاپیاں
بالکل سادی چھوڑ آتے تھے۔ رات رات بھر شعر و شاعری کی محفلیں
گرم ہوتی تھیں صبح کو پرچہ کیوں کر حل ہوتا وہ بھی حساب کا کیمسٹری کا"[1]

آگرہ کے قیام کے زمانہ میں جو غزلیں لکھی گئیں اور "آہنگ" میں شامل
ہوئیں ان کی تعداد بہت کم ہے[2] اس لئے رات رات بھر شعر و شاعری کی محفلیں
گرم ہونے کی بات زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتی محفلیں گرم ضرور ہوتی ہونگی مگر
محض شعر و شاعری کی نہیں اور اس خیال کی تصدیق میکش اکبرآبادی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

دوسری طرف آگرہ کے قیام کا زمانہ ان کی شاعری کے لئے بہت

---

[1] جگن بھیا از حمیدہ سالم

[2] ڈاکٹر محمد حسن کے پاس کچھ غیر مطبوعہ غزلیں موجود ہیں جو شاید ابتدائی
زمانہ کی ہوں ان کی اشاعت روک لینے کا کوئی اور سبب سمجھ میں نہیں آتا۔

مفید ثابت ہوا ۔۔ آگرہ کے ادبی ماحول نے ان کی صلاحیتوں کے ابھرنے کے مواقع فراہم کیے۔ وہ آگرہ پہونچے تھے تو میکش اکبرآبادی کے الفاظ میں شعر بھی معمولی سا کہتے تھے اور پڑھنا بھی خدا کا نام تھا" لیکن جب انٹر سائنس میں فیل ہونے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے وہ آگرہ سے روانہ ہوئے تو ان کی شاعری کی بنیادیں پڑ چکی تھیں اور یہ بنیادیں اس قدر مستحکم تھیں کہ ان پر اونچی سے اونچی عمارت تعمیر کی جا سکتی تھی۔

علی گڑھ میں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جس کی تہذیبی عظمت کا ترانہ مجازؔ نے بڑھا آن بان سے لکھا ہر طالب علمی کے تقریباً ۵ سال ان کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ اس کے بعد زندگی میں انھیں پھر کبھی مسلسل اتنے دنوں تک سکون مسرت، محبت اور بے فکری کی فضا میسر نہ ہو سکی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مجازؔ کی زندگی اور شاعری کی راہیں متعین ہوئیں اور زندگی اور شاعری نے ایسے گہرے اثرات قبول کیے جو مرتے دم تک برقرار رہے۔ ایک طرف تو اس درسگاہ کی اس وقت کی عام فضا اور کچھ نئے اور اشتراکی خیالات کے نوجوانوں کی صحبتوں نے ان کی شاعری اور شخصیت دونوں کو شان کجکلاہی اور مردِ انقلابی کا بانکپن عطا کیا اور دوسری طرف انھیں صحبتوں نے "شراب و شبستاں" میں کچھ اس طرح الجھایا کہ مجاز بار بار یہ اعلان کرنے کے باوجود کہ

شراب دشبستاں کا مارا ہوں لیکن
وہ غرق شراب دشبستاں نہیں ہیں

گھوم پھر کر بھی وادی میں رہے اور آخرکار اسی کوچے نے ان کی جان لی۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں ان کا داخلہ سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوا۔ پہلے ان کے والد کا خیال تھا کہ مجاز انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کریں گے۔ اسی لئے آگرہ میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا تھا لیکن سائنس ان سے نہ چلی تو علی گڑھ میں آرٹس میں داخلہ لیا مضامین میں فلسفہ، معاشیات اور اردو شامل تھی۔

سنہ ۱۹۳۲ء کے مجاز کے متعلق آل احمد سرور نے اپنے مضمون "مجاز رومانیت کا شہید" میں بتایا ہے کہ

"اس زمانے میں ان کا زیادہ تر وقت دوستوں کے کمروں پر گزرتا تھا۔ ان میں جان نثار اختر، اختر امام اور رحامد جو ٹینس کے اچھے کھلاڑی تھے یاد آتے ہیں۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء میں انجمن حدیقۃ الشعر کا سالانہ مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر نے کی تھی اور جس میں مولانا حسرت اصغر گونڈوی اور حفیظ جالندھری بھی شریک ہوئے تھے۔ طلباء

ۓ "سنہ ۳۲ء میں ایم اے کرنے علی گڑھ آیا تو مجاز یہاں سال بھر سے موجود تھے"۔ آل احمد سرور (علی گڑھ میگزین مجاز نمبر)

کے لئے اس میں نظم کا ایک عنوان "صبح بہار" رکھا گیا تھا۔ مجاز کی نظم پر شروع میں حسب معمول ہوٹنگ ہوئی مگر بعد میں اس کی رنگینی اور دلکشی اور پڑھنے والے کے پرسوز ترنم نے داد بھی حاصل کی۔ یہ مجاز کا علی گڑھ سے پہلا تعارف تھا۔

"جاں نثار اختر سے سب سے پہلے مجاز نے ہی ملایا تھا علی گڑھ میگزین کی ادارت کے لئے اس کے نگراں خواجہ منظور حسین صاحب سے انھوں نے ہی ملنے پر زور دیا تھا۔ میری ادارت کے زمانے میں مجاز کی نظم "نمائش میں" ایک غزل اور "انقلاب" اسی میگزین میں چھپیں۔

"اس زمانے میں بھی مجاز ایک مخلص دوست اور ایک زندہ دل رفیق کی حیثیت سے ممتاز تھے۔ نوجوان طلباء کا محبوب مشغلہ اشتہار کی سیر یا نمائش کے زمانے میں نمائش کے چکر تھے لوگ ادھر سے ادھر ٹہلتے رہتے خریداری سے کوئی مطلب نہ تھا ذوق نظر کی تسکین کافی تھی۔ "نمائش" اس زمانے کے تند و تیز اور والہانہ جذبات کی یادگار ہے [۱]۔"

بعد کے چند برسوں میں مجاز نئے خیالات کی اس رو سے متاثر ہوئے جو ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی میں شروع ہوئی تھی۔ وہ کچھ ایسے نوجوانوں

---

[۱] علی گڑھ میگزین مجاز نمبر

سے بھی قریب آئے جو سوشلزم اور اشتراکیت سے متاثر تھے اور جو اپنی تحریروں سے ترقی پسند ادب کی بنیادیں رکھ رہے تھے۔ ان میں اختر رائے پوری حیات اللہ انصاری۔ آل احمد سرور۔ سبط حسن وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں بعد میں جذبی، سردار جعفری۔ عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو بھی علی گڑھ پہونچ گئے تھے۔ مجاز نے ان دنوں اپنے ابتدائی دور شاعری کی بعض کامیاب نظمیں لکھیں۔ وہ اس زمانے میں جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کو اپنا محبوب شاعر تصور کرتے تھے۔ سردار جعفری نے بتایا ہے کہ "جوش کی رندی اور بے باکی اختر شیرانی کی معصومیت اور رنگینی اور حفیظ کی نغمگی نے اسے متاثر کیا تھا اور جب اس رندی اور بیباکی معصومیت اور رنگینی اور نغمگی نے مجاز کی شاعری میں تحلیل ہو کر ایک نیا روپ اختیار کیا تو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی سب سے حسین شاعری پیدا ہوئی"۔ [1]

اس زمانے کے مجاز کی جیتی جاگتی تصویر فرحت اللہ انصاری کے مضمون مجاز کچھ یادیں۔ کچھ باتیں [2] میں ملتی ہے وہ ان سے ایک سال جونیر لیکن ان کے نہایت قریبی دوستوں میں تھے۔ مجاز میرس روڈ پر رہتے تھے جو بقول ان کے گرلس کالج ہی کے لئے نہیں اور بھی انتخاب روزگار ہستیوں کے لئے مشہور تھی بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جو سارے علی گڑھ کی جنت نگاہ تھی"۔

---

[1] شاعر شہر نگاراں   [2] ادب اور تہذیب

ان دنوں مجاز کچھ اس قسم کے تھے۔

"ایک روز عثمانیہ کے برآمدے میں کسی نے ایک صاحب سے تعارف کرایا۔ سر پر کشمشی رنگ کی مخملی ٹوپی جس کی دیوار ذرا چوڑی سی، جسم پر لیونیفارم کے رنگ کی نیلی شیروانی جس پر سفید بنکیوں سے مہین مہین دھاریاں پڑی تھیں اور شروع سے آخر تک سارے بٹن لگے ہوئے تھے۔ علی گڑھ کٹ پاجامہ براؤن رنگ کا شو، بغل میں کتابیں لمبا سا قد، سانولا سا رنگ، دبلا پتلا سا بدن چہرے پر متانت اور سنجیدگی۔ معلوم ہوا کہ آپ اسرار الحق مجاز ہیں۔ لکھنؤ کے رہنے والے اور ایک ہونہار شاعر۔ ہاتھ ملایا تو ایسا نرم و نازک کہ زیادہ تپاک دکھانے کی جرأت نہ ہوئی۔"

انصاری صاحب کے مضمون کے مطالعہ اور ان سے زبانی بات چیت کے بعد یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ مجاز علی گڑھ یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں بڑی "آسودہ اور منضبط" زندگی بسر کر رہے تھے۔ یونیورسٹی کے بعد پابندی کے ساتھ گھر لوٹ جاتے تھے۔ سہ پہر کو نہا دھو کر کپڑے بدلتے اور گھومنے پھرنے اور دوست احباب سے ملنے کے لئے گھر سے نکلتے تھے اور رات کو کھانے سے قبل پابندی کے ساتھ گھر لوٹ جاتے تھے۔ ان کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے کے ایسے طلبا سے تھا جن کو معاشی طور پر خاصا سکون و اطمینان حاصل تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ خود گولڈ فلیک سگریٹ پیتے تھے جو خاصی مہنگی ہوتی تھی بلکہ دوستوں کی محفل میں بھی پہلے خود سگریٹ پیش کرتے تھے۔ وہ

ایک روپے بھی ہر وقت جیب میں پڑے رہتے تھے۔ ان کے گھر کے لوگ اور خاص طور سے ان کی والدہ ان کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھیں ان کے بھائی انصار (انصار ہروانی صاحب) کبھی کبھی دن بھی گھر سے غائب رہتے تو کسی کو تشویش نہ ہوتی مجاز ذرا وقت سے بے وقت ہو جاتے تو سارا گھر ان کے لئے بے تاب رہتا۔ ان کی والدہ کو خاص طور پر ان کی طرف سے فکر رہتی تھی کہ کسی کے بہلانے پھسلانے نہ آجائیں۔

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرحت اللہ انصاری کے مجاز کی "منضبط" زندگی سے متعلق تاثرات یا تو صرف اس زمانے کے تاثرات تک محدود ہیں جب ان کی مجاز سے پہلے پہل ملاقات ہوئی تھی یا پھر انھوں نے مجاز کی یہ تصویر کچھ جانبداری کے ساتھ کھینچی ہے، وہ اپنے معمولات کے اتنے پابند شاید ہی رہے ہوں۔ اس خیال کی بنیاد مندرجہ ذیل باتوں پر ہے۔

(۱) آل احمد سرور نے بتایا ہے کہ ان کا زیادہ تر وقت دوستوں کے کمروں پر گزرتا تھا۔

(۲) علی سردار جعفری نے بتایا ہے کہ جاں نثار اختر اور جذبی کی موجودگی کے باوجود مجاز یونیورسٹی کے سب سے مقبول شاعر تھے اور ہوسٹل میں طالب علموں کے کمروں پر، پروفیسروں کے گھروں میں، مشاعروں میں، جلسوں میں ہر جگہ چھائے ہوئے تھے۔ ؎

؎ لکھنؤ کی پانچ راتیں

(۳) ان کی بہن بیگم حمیدہ سالم نے بتایا ہے کہ حاضریاں پوری نہ ہونے کے باعث دو سال امتحان میں نہیں شریک ہو سکے [1]۔

ان شہادتوں کی موجودگی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ مشکل نہیں رہ جاتا کہ مجازؔ کی زندگی نہ عام طالب علموں کی سی رہی ہوگی اور نہ ہی وہ پابندی سے یونیورسٹی کے کلاسوں میں شریک ہوتے اور بعد میں پابندی کے ساتھ شام کو گھر لوٹ جاتے ہوں گے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ہی وہ واقعہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا جو مجازؔ کے اسی زمانے میں ساغر نظامی، اختر رائے پوری اور دوسرے دو ایک دوستوں کے ساتھ پہلی بار شراب پینے سے متعلق ہے اور جسے فرحت اللہ انصاری نے بڑی تفصیل [2] سے بیان کیا ہے۔ اس مخصوص حلقہ احباب میں مجازؔ کا شراب سے یہ شغل علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں پہلا تو تھا آخری نہیں تھا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں مجازؔ کی طالب علمی کے زمانے کے سلسلے میں ایک صاحب سے جو ان دنوں خود بھی مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور اب خاصی مشہور شخصیت کے مالک ہیں ایک ایسی بات بھی معلوم ہوئی ہے جس کا ابھی تک مجازؔ سے متعلق کسی مضمون میں ذکر نہیں آیا۔ مجازؔ یونیورسٹی کے ایک مشہور پروفیسر کی صاحبزادی پر عاشق ہو گئے تھے۔ ان کی ان دنوں کی مشہور نظم 'نمائش میں' کے ایک مصرعے میں ان خاتون کا نام بھی آیا تھا لیکن بعد میں یہ شعر نظم سے

---

[1] جگن بھیا (مجازؔ ایک آہنگ) [2] ادب اور تہذیب

خارج کردیا گیا[1]۔ دوسری طرف سے بھی حوصلہ افزائی ہوئی تھی اور بات پروفیسر صاحب کے بھی علم میں تھی لیکن معاملہ زیادہ آگے نہیں بڑھا۔ ان صاحب کا خیال ہے کہ غالباً مجاز خود ہی اس معاملے میں سنجیدہ نہ تھے۔ بیگم حمیدہ سالم نے بتایا ہے کہ "۱۹۳۸ء کے لگ بھگ علی گڑھ میں ایک متمول آزاد خیال گھرانے کی نہایت تیز طرار لڑکی نے صفیہ آپا کے ذریعے سے ان سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی"۔ لیکن مجاز نے انکار کر دیا۔ اس بات کی کہیں سے تصدیق نہیں ہو سکی کہ یہ خاتون وہی پروفیسر صاحب کی صاحبزادی تھیں کہ کوئی اور خاتون!

۱۹۳۵ء میں انھوں نے بی۔اے کر لیا اور ایم۔اے (اردو) میں داخلہ لیا۔ شاعر کی حیثیت سے انھیں اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی کہ پرانی روایتوں کے خلاف سال اول کے طالب علم ہونے کے باوجود میگزین کے اڈیٹر منتخب ہوئے لیکن ابھی دو تین مہینے ہی ہوئے تھے کہ انھیں دہلی میں ملازمت مل گئی اور ایم اے کیے بغیر ہی دہلی چلے گئے۔ علی گڑھ سے ان کا سلسلہ پھر بھی باقی رہا۔ عصمت چغتائی نے اس زمانہ میں گرلز کالج وغیرہ کے حلقوں میں ان کی بے پناہ مقبولیت کا اپنے مخصوص انداز میں بڑے بھرپور طریقے سے نقشہ کھینچا ہے[2]۔

---

[1] اس نظم میں کسی خاتون کا نام آجانے اور بعد میں متعلقہ شعر کے خارج کیے جانے کا تذکرہ فرحت اللہ انصاری نے بھی کیا ہے۔

[2] مجاز ایک آہنگ

ان کا کہنا ہے کہ مجازؔ اکثر علی گڑھ آتے اور یہاں کی لڑکیوں کو ریڈیو میں پروگرام دلانے کے لئے دہلی لے جایا کرتے تھے۔ پھر ۳۶ء میں جب کہ دہلی کی ملازمت ختم ہو چکی تھی علی گڑھ میں اردو کانفرنس کے موقع پر مجازؔ کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اس کے ذکر کے بغیر مجازؔ کے علی گڑھ کے قیام کے زمانہ کی روئیداد نامکمل رہے گی۔ آل احمد سرورؔ نے اس واقعہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

اس کانفرنس کے دوران یونین میں معزز مہمانوں کا خیر مقدم تھا۔ پنڈت کیفیؔ نے "اردو ہماری زبان" کے نام سے ایک مقالہ پڑھا پنڈت کیفی کی آواز پست تھی مائیک کا رواج اس وقت نہ تھا۔ ہال میں خوب شور ہوا۔ غرض جوں توں کر کے مقالہ ختم ہوا تو صدر نے اعلان کیا کہ اب اسرار الحق مجازؔ ایک نظم سنائیں گے۔ مجازؔ نے اپنی دلنشیں پرسوز آواز میں "نذر علی گڑھ" شروع کی۔ مجمع پر ایک بے خودی چھا گئی۔ لوگ جھوم جھوم اٹھے جب وہ اس شعر پر پہونچے

آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے

تو ہر طرف سے بے اختیار نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے ڈائس پر ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالرحمن صدیقی، مولوی عبدالحق صاحب تشریف فرما تھے۔ ذاکر صاحب نے بے ساختہ کہا مجازؔ صاحب

پھر بڑھے۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے ارباب حل و عقد اولڈ بوائز پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ خلافت کے زمانے کی طرح پھر علی گڑھ کو نقصان پہونچانا چاہتے ہیں۔ مجاز کے اس شعر میں اسی کا جواب تھا۔

"یہ زمانہ مجاز کی شاعری کا بہترین زمانہ تھا ان کی مقبولیت اپنے شباب پر تھی۔ مجاز میں قوت ارادی کی کمی شروع سے تھی دوستوں کی واہ واہ حسین خواتین کی داد مشاعروں کی مقبولیت نے ایک نشے کی سی کیفیت پیدا کر دی۔" [1]

---

[1] مجاز۔ رومانیت کا شہید (علی گڑھ میگزین مجاز نمبر

ریڈیو کی ملازمت اور معاشقہ

مجاز ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو کے قیام پر ریڈیو میں ملازم ہوئے۔ ان کی یہ ملازمت تقریباً سال بھر جاری رہی۔ وہ ریڈیو کے اردو رسالے "آواز" میں سب اڈیٹر تھے۔ اس رسالے کا نام مجاز نے ہی تجویز کیا تھا اور جیسا کہ ان کے انتقال پر لکھے جانے والے متعدد مضامین میں بتایا گیا تھا ریڈیو کے پروگراموں کا آغاز مجاز ہی کی غزل سے ہوا تھا جس کا مطلع ہے۔

سارا عالم گوش بر آواز ہے

آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر فیلڈن نام کے ایک انگریز تھے وہ ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے اتنے بڑے قدرداں تھے کہ ایک بار لاہور میں گورنر سے ملاقات کے بعد ڈاکٹر اقبال سے ملاقات کرنے جا رہے تھے تو اپنے کسی ملاقاتی سے کہا کہ لاہور کے سب سے چھوٹے آدمی سے مل کر آرہا ہوں ——— اور سب سے بڑے آدمی سے ملنے

جار ہا ہوں سلہ کچھ مسٹر فیلڈن کی ادب سے گہری دلچسپی اور کچھ پروفیسر بخاری (پطرس) کے ادبی ذوق کے بنا پر جو مسٹر فیلڈن کے نائب ہو کر دہلی آگئے تھے ملک کے متعدد اچھے ادیب شاعر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ریڈیو میں ملازم ہو کر دہلی پہونچ گئے۔ ان میں مجاز کے علاوہ ن۔ م۔ راشد، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، بیدی وغیرہ بھی شامل تھے۔

ریڈیو کی ملازمت سے علیحدگی کا سبب کچھ تو شغل مے وجام کی بدولت ان کی زندگی میں پیدا ہونے والی بے اعتدالیاں تھیں اور کچھ یوپی اور پنجاب کے ادیبوں کی وہ نوک جھونک جو کسی نہ کسی شکل میں آزادی سے قبل تک نجی ادبی مجمعوں سے لے کر ادبی رسائل کے صفحات تک چلتی رہتی تھی۔ ریڈیو میں ان دنوں یہ نوک جھونک پروفیسر بخاری اور دہلی والوں میں چل گئی تھی ان کے خاص حریف آغا اشرف تھے۔ جنھوں نے مجاز کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ مجاز کے مزاج میں وہ جو ایک خاص قسم کی ظرافت اور چست فقروں سے فطری لگاؤ سا تھا اسی کی بنا پر شروع شروع میں انھوں نے ان چھلے بازیوں میں حصہ لیا ہوگا جو بعد میں سنگین نوعیت اختیار کر گئیں۔

آل احمد سرور نے اس معاملے پر ان الفاظ میں روشنی

سلہ یہ واقعہ سرور صاحب نے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے۔

ڈالی ہے۔ "آغا اشرف کا تو کچھ نہ بگڑا بخاری نے ان کا تنزل کر دیا مجازؔ کو علیحدہ کر دیا گیا۔ رشید صاحب نے بخاری کو سمجھایا مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ اس زمانے میں مجازؔ ادبی حلقوں میں خاصے مقبول ہو چکے تھے وہ طبعاً سازشی آدمی نہ تھے مگر انھیں یہ غلط فہمی ہو چکی تھی کہ ادبی اہمیت کی بنا پر ملازمت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اشرف صاحب نکل گئے غریب مجازؔ اپنی سادہ لوحی کا شکار ہو گیا"[1]

علی سردار جعفری کے مضمون سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے مگر قدرے مختلف انداز میں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہنسی ہنسی میں پنجابی اور یوپی والوں کی صف بندیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ حفیظؔ جالندھری اور مجازؔ میں چوٹیں چلنے لگتی ہیں۔ حفیظؔ نے تفریحاً کوئی نظم لکھی مجازؔ نے اسی موڈ میں اس کا جواب دیا ایک شعر جو حفیظؔ کے متعلق تھا اس کا سب نے لطف اٹھایا۔

وہاں کا حسن تو سب کچھ ہے مانا
مگر خود عشق تو جالندھری ہے

لیکن یہ دوستانہ چھیڑیں زیادہ دن قائم نہ رہ سکیں۔ معاملات نہ جانے کیسے بگڑ گئے۔ آخر مجازؔ کو ریڈیو کی ملازمت سے استعفا

---

[1] علی گڑھ میگزین مجازؔ نمبر

دینا پڑا ہے۔ [۱]

مجاز اس ملازمت کے دوران معطل بھی کیے گئے تھے۔ یہ قصہ انھوں نے ۱۹۵۲ء میں خود بیان کیا تھا۔ [۲] معطلی کے دوران دو مہینے میں ان پر سات سو روپیہ قرض چڑھ گیا۔ ان کے گھر والوں کو ان کی شراب نوشی کی عادت کی اطلاع پہلی بار اسی زمانے میں ہوئی۔ اس معطلی کے بعد ان کی ملازمت بحال کردی گئی تھی یا وہ بعد میں برطرف کر دیے گئے تھے نیز یہ کہ اس معطلی کے دوران یا اس کے بعد انھوں نے خود استعفیٰ دے دیا تھا اس بارے میں کوئی بات حتمی طور پر معلوم نہ ہو سکی۔

اسی زمانے میں مجاز جس فلیٹ میں رہتے تھے اس کے نیچے والے حصے میں ایک نرس مس نورا سنگھ نام کی رہتی تھی۔ یہ کسی اسپتال میں ملازم نہیں تھیں بلکہ نجی طور پر نرس کا کام کرتی تھیں مجاز کی مشہور نظم "نرس کی چارہ گری" انھیں سے متعلق معلوم ہوتی ہے مس نورا سنگھ نے اسی زمانے میں مجاز کی شراب نوشی رد کنے کی کوشش کی اور کہا کہ "دو بوتلیں وہسکی کی تمھارے لیے ہیں لیکن اس کا عہد کرو کہ ہمارے ہی گھر پر پیو گے اور باہر کہیں نہیں پیو گے۔" [۳]

دہلی کی اس ملازمت کے دوران دو باتیں ایسی واقع ہوئیں جن کو مجاز کی زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ایک تو شراب نوشی نے لت کی

---

[۱] لکھنؤ کی پانچ راتیں [۲] ڈاکٹر محمد حسن کی ڈائری کے اوراق نقوش سنہ ۵۵-۵۶ء

صورت اختیار کی۔ اور علی گڑھ میں جو چیز "ادبی تبلیغ" (یعنی خیالات کے لحاظ سے باغی ہیں) نئے انداز کی شاعری کرنے میں شراب کباب (نہیں) کے طور پر اپنائی گئی ہو گی وہ اب دہلی پہونچ کر ضروریات زندگی میں داخل ہو گئی ویسے تو دہلی میں بھی بہت سے نئے ادیب شاعر اکٹھا ہو گئے تھے اور یہاں کا حلقہ علی گڑھ کے ادبی اور سیاسی حلقہ سے بڑا بھی تھا۔ پھر دہلی میں مسلم یونیورسٹی کی جیسی پابندیاں بھی نہ تھیں اور زیادہ تر ادیب شاعر کسی نہ کسی حد تک ذوق مے و مینا سے سرشار تھے لیکن مجاز اس میدان میں اپنے دوستوں اور ہم عصروں سے آگے نکل گئے۔ ان کی شراب نوشی سے گہری دلچسپی کے باعث انھیں دہلی میں ایک بالکل نیا حلقہ مل گیا اور وہ دھیرے دھیرے علی گڑھ کے دوستوں سے بے نیاز ہونے لگے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ فرحت اللہ انصاری نے جو اس وقت تک علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے اور پابندی کے ساتھ مجاز سے ملنے کے لئے ہر سنیچر کو دہلی جاتے اور وہ مجاز اور جذبی وغیرہ سنیچر کی شام کو جشن مناتے تھے انھوں نے دہلی آنے جانے کا سلسلہ کم کر دیا اور بقول ان کے سنیچر کی شاموں کی اہمیت تقریباً ختم ہو گئی۔ مجاز کی شراب سے بڑھتی ہوئی اس دلچسپی کے باعث ایک روز جذبی رات کو ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔[1]

دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ مجاز کو ایک "شجر ممنوعہ" قسم کی خاتون سے

---

[1] مجاز۔ چند یادیں چند باتیں

عشق ہو گیا جس کا ذکر بیگم حمیدہ سالم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"دلی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی، چنچل، البیلی خوبصورت لاڈ پیار میں پلی ہوئی، عیش و عشرت کی عادی، ایک عدد بھاری بھر کم شوہر کی ملکیت یا مالک جو کچھ سمجھئے، یہ بیل منڈھے چڑھتی تو کیوں کر"۔ [1]

آل احمد سرور نے اس سلسلے میں خیال ظاہر کیا ہے:۔

"اب تک دل پر جو زخم آئے تھے وہ ذرا ہلکے تھے، مگر دہلی میں ایک زخم ایسا کاری لگا کہ اس کی چوٹ ساری عمر نہ گئی۔ شروع میں دلنوازی اور لطف و کرم سب کچھ تھا مگر مجاز کچھ اس سے زیادہ چاہتے تھے آخر مایوسی ہوئی مگر مجاز کی خوبی یہ تھی کہ افسردگی کے باوجود لہجے میں تلخی نہ آئی"۔ [2]

فرحت اللہ انصاری نے جو اس قصے سے اچھی طرح واقف تھے لکھا ہے کہ:۔

"یا یہ عالم تھا کہ مجاز کے بغیر چاندنی رات بھی اندھیری رات تھی۔ جب تک مجاز کے قدم ایوان عشرت میں نہیں پہونچتے تھے۔ وہاں نیند نہیں آتی تھی۔ ساری ساری رات اس کے انتظار میں آنکھوں میں کٹ جاتی تھی۔ اس کے اشعار گنگنائے جاتے تھے اس کی دھن اتاری جاتی تھی۔ اس کے شانے پر سر رکھ دیا جاتا تھا۔ یا مجاز کی در

---

[1] جگن بھیا

کی غزل خوانی میں بھی رسوائیاں جھلکنے لگیں۔ انہیں آوارہ و مجنوں کے
خطاب ملنے لگے نصیحتیں کی جانے لگیں آخر دربان کو حکم ہوا کہ مجاز
پھاٹک میں بھی قدم نہ رکھنے پائے۔" لہ

اس عشق کی بدولت نشاطیہ اور حزنیہ دونوں جذبات و کیفیات
کی ترجمانی کرنے والی کئی بہت اچھی نظمیں تخلیق ہوئی ہیں جن میں "آوارہ" اور
"اعتراف" جیسی لافانی نظمیں بھی شامل ہیں اور مجاز کے انتقال کے بعد
نوری صدمہ کے تحت جذباتی انداز میں لکھے جانے والے زیادہ تر مضامین میں
ان خاتون کو مجاز کی زندگی کے المیہ کی بے رحم ہیروئن کے روپ میں پیش کیا
گیا ہے۔ اس نسل سے تعلق رکھنے والے ادیبوں شاعروں کو ان خاتون کا نام
بھی معلوم ہے۔ لیکن چونکہ یہ خاتون بھی زندہ ہیں اور ان کے بھائی بھی کم
شوہر بھی اور ان کے وقار اور مرتبہ میں کچھ اضافہ ہی ہو چکا ہے اس لئے
کسی نے ان کا نام لینے یا کھل کر لکھنے کی جسارت نہیں کی صرف "زہرہ جبینوں"
جیسے الفاظ کی مدد سے ان کی طرف اشارے کر دیئے گئے ہیں اور بس۔ لیکن
راقم الحروف بعض ذمہ دار حضرات سے جو ان خاتون سے بھی واقف ہیں
اور مجاز سے بھی قریبی مراسم رکھتے تھے بات چیت کرنے کے بعد اس نتیجے
پر پہونچا ہے کہ ان خاتون کی دل نوازیاں بے اعتنائیاں جس نوعیت کی
بھی رہی ہوں اکیلے ان کی ذات کو مجاز کی بربادیوں کا سبب قرار دینا بڑی

لہ ادب اور تہذیب

زیادتی کی بات ہے۔ دراصل مجاز کی بربادیوں میں کسی دوسرے سے کہیں زیادہ خود ان کا اپنا ہاتھ تھا۔ وہ "خود اپنے ہی مذاق طرب آگیں کا شکار" تھے لیکن رومانیت کے اس شہید کے لیے ایک بے رحم محبوبہ کا تصور چونکہ بجائے خود بڑا رومانی تھا اس لیے ان کے انتقال پر اسی تصور کو زیادہ ابھارا گیا۔

مجاز کے اس معاشقے کے سلسلے میں ان کے قریبی دوست علی جواد زیدی کی یہ رائے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ "وہ کسی ایک (عورت) کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا[1]۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مجاز نے اس عشق کی ناکامی کے بعد لکھنؤ میں ایک اسی قسم کی دوسری خاتون پر جو (وہ اس وقت بھی شادی شدہ تھیں) زندہ اور دہلی والی خاتون ہی کے جیسے صاحب مرتبہ شوہر کی بیوی تھیں ایک نظم بھی جس کا عنوان ہے "مادام" دہلی والا زخم ایسا ہی کاری ہوتا تو وہ تھوڑے ہی عرصہ بعد کسی دوسری "مادام" کے حسن کا قصیدہ اس آن بان سے لکھنے نہ بیٹھ جاتے[2]۔

ایک اور بات بھی معلوم ہوئی ہے جو کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ ایک صاحب نے جو مجاز کے علی گڑھ یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں بھی ان کے ساتھ تھے۔ سنہ ۳۶، ۳۷ء میں دہلی میں مقیم تھے مجاز سے ان کا ملنا جلنا رہتا تھا اور اب خاصی معروف شخصیت[3] کے مالک ہیں بتایا کہ دونوں مجاز کا

---

[1] تاثرات (قومی آواز مجاز نمبر)

[2] اس واقعہ کے راوی فرحت اللہ انصاری ہیں

[3] اس خاص بات کے انکشاف کے سلسلے میں ان صاحب نے اپنے نام کے استعمال کی

دہلی کے بعض "شبستانوں" میں بھی آنا جانا تھا اور وہاں کی ایک لڑکی سے ان کا سلسلہ بھی چل رہا تھا انھوں نے بتایا کہ مجاز کی مشہور نظم "آوارہ" میں اس "بازاری لڑکی" کا نام بھی آگیا ہے اور جہاں تک انھیں یاد پڑتا ہے "آوارہ" کے جس بند میں اس کا نام آیا ہے اس کے مصرعے یہ ہیں۔

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل

ظاہر ہے کہ شراب "شبستان" اور "دہلی کے چوٹی کے گھرانے" کی شادی شدہ خاتون سے عشق و محبت، تینوں چیزیں بیک وقت خوش اسلوبی سے نہ چل سکتی تھیں نہ چلیں اب اس صورت حال کی ذمہ داری چاہے سماج پر ڈالی جائے چاہے اس ذہین، حساس اور ہونہار نوجوان شاعر پر جو اس زمانے میں مولانا حسرت کے شعر کی زبان میں "شوق کی بلندی" اور "ہمتوں کی پستی" کے تضاد کا شکار ہو رہا تھا۔

لکھنؤ کو واپسی اور نیا ادب کا حلقہ

ریڈیو کی ملازمت ختم ہونے کے بعد کچھ دن مجازؔ دہلی میں مقیم رہے کچھ وقت بعض دوسرے شہروں میں گزارا پھر وہ لکھنؤ آ کر اپنے والدین کے ساتھ نیو حیدر آباد میں مقیم ہو گئے۔ اسی زمانے میں لکھنؤ ترقی پسند ادب کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ سبط حسن انجمن ترقی اردو (ہند) کی صوبائی شاخ کے آرگنائزر بن کر حیدر آباد سے لکھنؤ آ گئے تھے۔ علی سردار جعفری نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ حیات اللہ انصاری ہفتہ وار "ہندستان" نکال رہے تھے۔ معین احسن جذبیؔ ایک عارضی ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ آ گئے تھے۔ سجاد ظہیر بھی الٰہ آباد سے لکھنؤ آ گئے تھے۔ ان سب کے علاوہ ڈاکٹر عبدالعلیم، احمد علی اور سید احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں بھی لکھنؤ میں تھیں۔ ایک خاتون نے اپنا لال باغ کا فلیٹ ان لوگوں کو دفتر کے قیام کے لئے دے دیا۔ اور "پرچم" نکلنا شروع ہوا جس کے نگراں سبط حسن تھے اور سردار جعفری مجازؔ اور

جذبی محاذین میں شامل تھے۔ اس اثنا میں پہلی کانگریس وزارت قائم ہو چکی تھی اس نے "پرچم" کا پہلا ہی پرچہ ضبط کر لیا۔ پھر "آزادی کی نظمیں" نامی کتاب ترتیب دی گئی اور مارچ ۱۹۳۹ء میں سبط حسن سردار جعفری اور مجاز نے مل کر "نیا ادب" نکالا۔ جولائی ۳۹ء میں جوش ملیح آبادی بھی لکھنؤ آگئے[1] اور ان کا رسالہ "کلیم" "نیا ادب" میں مدغم ہو گیا۔

مجاز اس حلقے میں بہت مقبول تھے جس کے بقول سردار جعفری چار مشغلے تھے، تعلیم، ادب، سیاست اور آوارہ گردی۔ یہ حلقہ نوعمر ترقی پسندوں پر مشتمل تھا لیکن ان میں سے کوئی ایک کو شاعر یا افسانہ نگار کی حیثیت سے ملک گیر شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں ان لوگوں کی سرگرمیوں کے مرکز کہاں کہاں تھے۔ اس کا اندازہ سردار جعفری کے مضمون "راجہ سنگھاسن ڈانواڈول" سے ہوتا ہے۔

ایک سرے پر فرنگی محل تھا جس کے روشن خیال اور خوش اخلاق علما کے ساتھ نہایت ادب سے انتہائی بے باک بحثیں کی جاتی تھیں دوسرے سرے پر ریڈیو کی مشہور لگانے والی گوہر سلطان کا وہ گھر تھا جسے ہم خرابات کہتے تھے۔ ان دونوں سروں کے درمیان نیشنل ہیرالڈ، پانیر، ہندستان، ولپو[2] اور نیا ادب کے دفاتر یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ حبیب اللہ صاحب

---

[1] یاد مجاز: محمد رضا انصاری (نقوش) ۵۶-۵۵ ص
[2] ہندی کا رسالہ جسے مشہور ہندی ادیب یشپال نکالتے تھے۔

کا گھر، پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی کا کتب خانہ، وائی ڈبلو سی اے
کا خوبصورت ہال جہاں بابا سرکار[1] شمع محفل ہوا کرتی تھیں۔ اور
نہ جانے کتنے کافی ہاؤس، ریسٹوران اور مے خانے تھے۔[2]

سردار جعفری نے اس زمانے کی جو یادیں قلم بند کی ہیں ان میں سے بعض بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً سبط حسن، مجاز اور جعفری نے انگریزوں کو چڑھانے کے لئے ایک کتا پال کر اس کا نام نیلسن رکھا اور آخر حضرت گنج میں اسی کتے کے نام کی وجہ سے نسلی بلوا ہوتے ہوتے ایک انگریز سے ان لوگوں کی ہاتھا پائی ہو گئی اور مجاز نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی نظم "راج سنگھاسن ڈانواڈول" کے مصرعے مکمل کئے حالانکہ اس نظم کا آغاز بالکل مختلف احوال میں گوہر سلطان کے گھر پر جو "ینگ لیڈی" کے نام سے اس حلقہ میں مشہور تھیں سبط حسن اور حیات اللہ انصاری کے درمیان جھگڑے کے موقع پر ہوا تھا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز کے بعد دھیرے دھیرے اس حلقہ کے لوگ منتشر ہو گئے۔

---

[1] ان خاتون کی جمیل نام کے ایک افسر کی شادی ہو گئی تھی جو سکریٹریٹ میں ملازم تھے۔ بابا جمیل کے نام سے ۱۹۵۵ – ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں لکچرر تھیں۔ بعد میں اپنے شوہر کے ساتھ کراچی چلی گئیں۔ [2] لکھنؤ کی پانچ راتیں۔

جنون کا پہلا دورہ

اسی زمانے میں سنہ ۱۹۴۰ء میں مجاز پر جنون کا پہلا دورہ پڑا۔ بیگم حمیدہ سالم نے خیال ظاہر کیا ہے کہ دہلی کے معاشقہ کی ناکامی کے باعث مجاز کا پورا وجود اندر ہی اندر سلگ کر رہ گیا تھا اور سلگتے سلگتے سنہ ۱۹۴۰ء میں یہ آتش فشاں پھوٹ ہی پڑا۔ یہ زبردست بریک۔ ڈاؤن کا حملہ تھا۔ لیکن مجاز کے اس زمانے کے قریبی دوست فرحت اللہ انصاری کے مضمون "مجاز' کچھ یادیں۔ کچھ باتیں' کے مطالعہ اور ان سے تفصیلی بات چیت کے بعد راقم الحروف اس نتیجے پر پہونچا ہے کہ اس جنون میں ان کے "نیا ادب" کے حلقہ کے ساتھیوں کے رویہ اور ان "ینگ لیڈی" گوہر سلطان سے ان لوگوں کے معاملات کا بھی بہت کچھ ہاتھ تھا۔

انصاری صاحب نے اس قصے کا بڑی تلخی سے لیکن مصلحتاً مبہم انداز میں تذکرہ کیا ہے۔

"ان رفیقان کار کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ آگے

نکل جانا تو جانتے تھے مگر ساتھیوں کو ساتھ لے کر چلنا نہیں جانتے تھے۔ مجاز زبان پر تو غالب کا شکوہ "کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا" نہیں لایا مگر اس کی خاموشی بھی کچھ ایسی ہی فریاد کرتی رہی۔ "یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح"۔ ادبستانوں میں یہ نصیحت کہ غزل خوانی چھوڑو [۱] شبستانوں میں یہ انتباہ کہ مجاز سے ہوشیار رہو اور تنہائیوں میں یہ مشورہ کہ ہٹاؤ بھی اس "خبط" کو اور جب اس "خبط" کو ہٹانے کی کوشش میں اس سے کوئی لغزش [۲] ہو گئی تو چٹکیاں لینا، طعنے دینا آخر اس کا دماغ خراب ہو گیا۔

"کہتے ہیں کہ دماغ کی خرابی کے زمانے میں وہ "ینگ لیڈی" "ینگ لیڈی" کہا کرتا تھا چنانچہ نہ وہ مجاز کو دیکھنے گئیں نہ کوئی ایسا شخص جانے دیا گیا جس سے "ینگ لیڈی" کے خیال میں ہیجان بڑھ جاتا۔ مگر جب مجاز اچھا ہو گیا تو ہم سب نے دیکھا کہ وہی حضرت ناصح [۳]

---

[۱] سیاسی نعرہ بازی کی شاعری کرنے کا جو مطالبہ ان کے دوستوں نے کیا تھا اس کے جواب میں مجاز نے یہ نظم کہی تھی "میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعر محفل وفا مطرب بزم دلبراں

[۲] یہ "لغزش" مجاز سے دراصل "انھیں" ینگ لیڈی کے سلسلے میں ہوئی تھی ایک صاحب نے جو نیا ادب گروہ سے تعلق رکھتے تھے بتایا ہے کہ سبط حسن نے کہا کہ وہ ان کے راز لوگوں کو بتا دیں گے جس کا مجاز کے دماغ پر گہرا اثر پڑا۔ [۳] سبط حسن کی طرف اشارہ ہے۔

"ینگ لیڈی" کے لئے دیوانے ہو گئے۔ نہ شبستاں نہ ادبستاں،
ہر ایک نے اپنا اپنا جہالستان الگ بنا لیا۔ مجاز غریب پھر
اکیلا رہ گیا" [1]

اس زمانے میں وہ بار بار کہتے کہ فلاں فلاں مجھ سے شادی کرنا
چاہتا ہے اور رقیب روسیاہ مجھے زہر دینے کی فکر میں ہے۔ علاج معالجہ سے
صحت ٹھیک ہوئی تو ملازمت کا خیال آیا۔ کچھ دن بمبئی انفارمیشن آفس
میں کام کیا لیکن وہاں سے پھر لکھنؤ آگئے اور ۴۳ء میں ہارڈنگ لائبریری
میں ملازم ہو کر دہلی چلے گئے۔

---

[1] ادب اور تہذیب

ہارڈنگ لائبریری کی ملازمت

دہلی میں ریڈیو کی ملازمت کے خاتمے کے بعد وہاں سے واپس لوٹتے وقت مجاز نے ایک نظم لکھی تھی جس میں اس شہرِ طرب سے یہ پیمان باندھا تھا کہ وہ بہ "اندازِ دگر" واپس دہلی پہنچیں گے ان کی مراد کامیاب و کامراں لوٹنے سے تھی لیکن حالات کی ستم ظریفی کہ انھیں پہلے سے خراب ملازمت اختیار کر کے دہلی لوٹنا پڑا۔ ۱۹۴۳ء میں وہ ہارڈنگ لائبریری میں ملازم ہوئے۔ بیگم حمیدہ سالم کا کہنا ہے کہ وہ اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے تھے لیکن اردو شاعر رفعت سروش (جو ان دنوں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھے) سے جن کے اس زمانے میں مجاز سے دوستانہ تعلقات تھے معلوم ہوا ہے کہ مجاز کاؤنٹر کلرک تھے اور کتابیں ایشو کیا کرتے تھے۔

آل احمد سرور نے بھی لکھا ہے کہ وہ لائبریری میں کلرک تھے۔ یہاں وہ ۱۷ مئی ۱۹۴۳ء کو ملازم ہوئے تھے جیسا کہ ان کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو انھوں نے ۸ مئی ۱۹۴۳ء کو جب کہ وہ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کا

کے یہاں دہلی میں مقیم تھے محمد رضا انصاری (فرنگی محلی) کو لکھا تھا۔ ان کے خط کا متعلقہ حصہ حسب ذیل ہے۔

"اب صورت یہ ہے کہ وہی ہوا جس کا میری طرف سے اندیشہ تھا یعنی پھر نوکری کر لی۔ مگر اس سے قبل بنے (سجاد ظہیر) وغیرہ سے مشورہ کر لیا تھا لہذا ضمیر اور دل دونوں مطمئن ہیں۔ معاملہ سرکاری نہیں ہے اس لئے کوسنا نہیں۔

"اب صورت یہ ہے کہ ۱۵ سے کام شروع کر رہا ہوں اس شرط پر کہ بمبئی کی کانفرنس (ترقی پسند مصنفین کی تیسری سالانہ کانفرنس جو مئی ۴۳ء میں ہوگی) کے لئے چار پانچ دن کی چھٹی مل جائے گی" [1]

رفعت سروش کے بیان کے بموجب مجاز یہاں وسط ۴۵ء تک ملازم رہے۔ لائبریری کی ملازمت کے علاوہ وہ رسالہ "ادیب" (جس کے اڈیٹر فصیح الدین احمد تھے) میں بھی کام کرتے تھے۔ ان کا نام اس رسالے کے نائب مدیر کی حیثیت سے نہیں چھپتا تھا مگر اس کی ترتیب اور ایڈیٹنگ میں وہ کافی مدد کرتے تھے ان کا تازہ کلام اس میں چھپتا تھا اور وہ کتابوں پر تبصرے بھی کرتے تھے۔ دہلی میں ادیبوں شاعروں سے ان کے دوستانہ اور گہرے مراسم تھے ان میں وہ ادیب شاعر بھی

---

[1] مطبوعہ "نقوش" ۵۶-۵۵ء

شامل تھے جو آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔ آغا سرخوشؔ قزلباش مرحوم سے (جو رسالہ چمنستان نکالتے تھے) بھی ان کی گہری دوستی تھی انھوں نے اپنے مکتبہ سے مجازؔ کا شعری مجموعہ "شب تاب" وسط ۱۹۴۵ء میں شائع کیا تھا جس میں "آہنگ" کی نظمیں ترتیب بدل کر اور کچھ نئی نظمیں شامل تھیں۔ سیاسی اور سماجی کارکنوں سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی حمایت کر رہی تھی اور بہت سے مسلمان کمیونسٹ مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ مجازؔ نے انھیں دنوں "پاکستان ہمارا" نامی ترانہ لکھا تھا اور مسلم لیگ کے ایک جلوس میں لہک لہک کر اسے سنایا تھا۔ رفعت سروش کا کہنا ہے کہ اس ترانے کے کچھ بند ایک دوسرے مشہور ترقی پسند شاعر[1] نے لکھے تھے اور کچھ بند مجازؔ کے تھے لیکن کسی دوسرے ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

ہارڈنگ لائبریری کی اس ملازمت کے دوران دہلی کی ان خاتون سے جن سے محبت کی ناکامی "آوارہ" کی تخلیق کا باعث بنی ہوئی تھی مجازؔ کی دوبارہ راہ و رسم کی ایک سے زائد شہادتیں ملتی ہیں لیکن اس بار ان مراسم کی نوعیت کیا تھی اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اس ملازمت کے دوران گھر کے لوگوں نے مجازؔ کی شادی کے لئے کوشش کی۔ لکھنؤ میں ایک خاتون جو برسرروزگار بھی تھیں ان سے شادی کرنے پر راضی ہو گئیں۔ مجازؔ دہلی سے بردکھوے کے لئے لکھنؤ بلائے گئے۔ لیکن ان خاتون کے والد نے جو بیگم حمیدہ سالم کے مضمون کے بموجب ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ

---

[1] سردار جعفری سے مراد نہیں

کمانے والے کالج کے پرنسپل تھے ڈیڑھ سو روپیہ کمانے والے مجازؔ کو اپنی بیٹی کے لئے مناسب خیال نہ کیا اور انکار کر دیا۔

مجازؔ اپنی اس ملازمت سے قطعی مطمئن نہ تھے۔ رفعت سروش کا کہنا ہے کہ انھیں لائبریری میں سخت گھٹن محسوس ہوتی تھی اور کہتے تھے کہ "یہ قبرستان ہے۔ ان الماریوں میں مردے سجے ہوئے ہیں" ان دنوں وہ اپنے ایک وکیل دوست عطاء الرحمٰن کے ڈرائنگ روم میں چاندنی چوک میں رہتے تھے۔ لکشمی رسٹورنٹ کے سامنے اسی مکان کے نیچے ایک پنواڑی کی دوکان تھی جس سے وہ دیسی شراب ادھار لیتے تھے اور جب جیب میں پیسے ہوتے تو لکشمی رسٹورنٹ یا جگت سینما کے اوپر والے بار میں شغل مے کرتے۔"[1] اس قسم کے حالات میں لکھنؤ میں شادی کے معاملے میں اس طرح ٹھکرا دیئے جانے کا ان کے دماغ پر سخت اثر پڑا اور ایک بار پھر ان پر جنون کا دورہ پڑا۔

---

[1] راقم الحروف کے نام خط میں

جنون کا دوسرا دورہ

۱۹۴۵ء میں مجاز کئی طرح کی الجھنوں اور ذہنی پریشانیوں کا شکار رہے۔ ایک طرف تو ان کی زندگی کا وہ تضاد تھا جس کی طرف آل احمد سرور نے اشارہ کیا ہے یعنی کلرک کی زندگی اور مشاعروں کی مقبولیت اور اونچے سے اونچے گھرانوں کی واہ واہ اور دوسری طرف شادی کے سلسلے میں لڑکی کے باپ کی طرف سے انکار کا ردعمل تھا تیسری خاص بات یہ ہوئی کہ دہلی سے ان کی محبوبہ کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ آئیں اور "اعتراف" لکھی گئی۔ اسی زمانے میں دہلی کی ملازمت بھی چھوٹی یا چھوڑی۔ قطعی طور پر یہ انہیں معلوم ہو سکا کہ یہ تینوں چاروں باتیں کس ترتیب کے ساتھ واقع ہوئیں اور ان میں سے کس خاص واقعہ نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا اور ان کی دماغی حالت پھر گڑبڑ ہو گئی۔ بہت ممکن ہے یہ کئی باتوں کے ملے جلے ردعمل کا نتیجہ ہو یا کسی ایک ہی واقعے کا بہرحال ۱۹۴۵ء میں ان پر جنون کا دوسرا حملہ ہوا۔ لکھنؤ میں ڈاکٹروں کی کوشش اور گھر والوں کی تیمارداری

اور دل جوئی سے دھیرے دھیرے طبیعت سنبھل گئی۔ جنون کی اس حالت میں اپنی عظمت پر بہت زور دیتے تھے۔ شاعروں کی فہرست تیار کرتے اور غالب اور اقبال کے بعد اپنا نام لکھ کر فہرست ختم کر دیتے۔

کچھ دنوں بعد ٹھیک ہوئے تو بمبئی کا رخ کیا لیکن اب وہ پہلا سا دم خم باقی نہ تھا۔ وہ کچھ عجیب بے جان سے ہو چلے تھے۔ شاید یہی زمانہ تھا جس کے متعلق شوکت تھانوی نے خیال ظاہر کیا تھا کہ "مجاز نے فیصلہ کر لیا کہ انھیں زندگی بسر کرنے کی ضرورت نہیں، زندگی کو خود ضرورت ہو تو انھیں بسر کر لے۔"[1]

بمبئی میں ان دنوں مجاز کا کیا عالم تھا اس کے متعلق عصمت چغتائی کے تاثرات یوں ہیں :-

"ملی تو دیکھا کہ صورت ہی دوسری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں طوفان اور ریلے گزر گئے ہیں جو چہرے کے سارے احساسات اور جذبات اڑا کر لے گئے۔ جیسے یہ شخص کچھ سنتا ہے اور نہ سوچتا ہے اور نہ ہی آئندہ اس قسم کی حماقت کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔

"کھانے والوں کے ساتھ کھا لینا، چلتے دیکھ کر چل پڑنا، بیٹھے دیکھ کر بیٹھ جانا اور رخصت ہوتے دیکھ کر ان کے پیچھے سرک جانا، عدم اور

---

[1] مجاز۔ ایک آہنگ

وجود کچھ ایک ہی جیسا جسم تو ہے مگر آگے سراغ نہیں ملتا کہ دوسرے لوازمات کہاں بھٹک رہے ہیں۔ مشاعروں میں کھڑا کر دیا تو ہاتھ سوکھے پتوں کی طرح آواز گویا کوسوں دور سے گرتی پڑتی چلی آرہی ہے۔

"لوگوں نے رائے دی کہ پیسے کماؤ، اللہ نے چاہا تو سارے روگ دور ہو جائیں گے۔ آپ نے دو چار فلمی گیت لکھ کر پیسے کما ڈالے اور فوراً ہی اللہ شافی کر گئے۔" سلہ

اس قسم کا انسان ظاہر ہے کہ بمبئی کی بہت ہی تیز رفتار اور بہت ہی کاروباری دنیا میں کس طرح کامیاب ہوتا۔ ۱۹۴۶ء کے دوران بمبئی میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکی تو مجاز کمیونسٹ پارٹی کے دفتر گول پیٹھا میں رہتے تھے۔ سلہ پارٹی آفس کے نیچے پکے بعد دیگرے کئی انسانوں کو خون میں نہاتے دیکھا تو وہ اس روح فرسا منظر کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔ تین دن تک حواس بجا نہ ہوئے۔ پھر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یوم آزادی کے موقع پر بمبئی کی سڑکوں پر "راج سنگھاسن ڈانوا ڈول" گا گا کر رقص کرتے رہے۔ سلہ اور دوسرے دن آزادی کے سلسلے میں جلسہ ہوا تو انھوں نے اپنی نئی نظم کے

سلہ مجاز۔ ایک آہنگ

سلہ رفعت سروش (راقم الحروف کے نام خط)

سلہ سردار جعفری (لکھنؤ کی پانچ راتیں)

ذریعے ہندستان کی تاریخ کے اس مبارک دن کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

بمبئی سے جب ادب گیا تو پھر لکھنؤ واپس آ گئے اور یہاں دو تین دوستوں کے ساتھ جن میں سے ایک کو ان دنوں خاصی بجلی اقتدار حاصل تھا، شراب کی محفلوں میں پوری طرح الجھ کر رہ گئے۔ یہ صاحب جو مجاز کے بہت ہی قریبی دوست تھے کچھ دنوں بعد پاکستان چلے گئے جس کا مجاز کو بہت قلق ہوا۔ مگر لکھنؤ میں ان دنوں ایک نیا ادبی گروہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ آل احمد سرور کی سرپرستی میں بیرون وزیر واقع چھوٹی سی کوٹھی میں ہر اتوار کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوتے تھے۔ یہ جلسے کس پیمانے کے ہوتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کبھی کبھی بیک وقت آل احمد سرور، سید احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر رشید جہاں، پنڈت آنند نرائن ملا، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، سراج لکھنوی، رضیہ سجاد ظہیر، شوکت صدیقی، ممتاز حسین، محمد حسن، سلام مچھلی شہری، حسن شہیر، کمال احمد صدیقی اور متعدد دوسرے ادیب شاعر بیک وقت جلسے میں موجود ہوتے اور ہفتہ وار جلسوں پر ادبی کانفرنس کا گمان گزرتا۔ کبھی کبھی حیات اللہ انصاری بھی آ جاتے اور انجمن کے متعلق دلچسپ اور گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ مجاز بھی ان جلسوں میں آتے اور ان جلسوں میں انھیں بہت زیادہ مقبولیت بھی حاصل تھی۔ شام کو کافی ہاؤس میں سب لوگ اکٹھا ہوتے تھے اور دلچسپ باتوں میں مجاز اپنے ممدوں

کو بھولے رہتے۔

دو تین سال یہ محفلیں چلتی رہیں پھر لوگ دھیرے دھیرے منتشر ہونا شروع ہو گئے۔ مجاز لکھنؤ سے مشاعروں کے لئے ملک کے مختلف شہروں کو جاتے اور وہاں مشاعروں کے بعد بھی کچھ دنوں ٹھہرے رہتے اور پھر لکھنؤ لوٹ آتے۔ اس قسم کے شہروں میں دہلی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ جوش صاحب "آج کل" کے اڈیٹر ہو گئے تھے۔ اردو کے بہت سے ہندو ادیب شاعر پاکستان سے دہلی آ گئے تھے، اعلیٰ سرکاری افسروں میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے جن کو اردو مشاعروں سے گہری دلچسپی تھی۔ اس طرح تقسیم کے تلخ حالات کے بعد زندہ دلانِ پنجاب کی کوششوں سے دہلی میں ایک بار پھر اردو شعر و سخن کی نئی محفلیں جمنے لگی تھیں لیکن دہلی کی دنیا لکھنؤ کے ماحول سے مختلف تھی۔ یہاں دولت کی فراوانی تھی اور اردو شاعروں کو ایسے قدرداں ملنے لگے تھے جو مشاعروں کی راتوں کو یا ویسے بھی کسی رات کو اچھی شراب سے نہلا سکتے تھے۔ مجاز کچھ تو جوش صاحب کی وجہ سے اور کچھ شاعروں کے انھیں قدردانوں کی وجہ سے دہلی میں زیادہ وقت گزارنے لگے۔ بعض اوقات وہ لکھنؤ سے دہلی جاتے تو مہینہ مہینہ بھر وہاں پڑے رہتے۔ دہلی میں شراب کی کمی نہ تھی۔ اور مجاز اب زندگی کی اس منزل پر تھے جہاں شراب کی تشنگی لاکھ پینے پر بھی نہیں ختم ہوتی تھی۔ ان کے سینے میں ایک جہنم تپاں تھا وہ اس جہنم کو بجھانا چاہتے تھے لیکن شراب آگ پر تیل کا کام کرتی جا رہی تھی۔

سفرِ پاکستان

۵۹ء میں مجازؔ پاکستان گئے۔ کراچی کے کسی بڑے مشاعرے میں مدعو کیے گئے تھے وہاں ان کی ملاقات اپنے بہت سے پرانے دوستوں اور رفیقوں سے ہوئی۔ ان میں نصیر حیدرؔ[1] بھی شامل تھے جو آزادی کے ایک آدھ سال بعد تک لکھنؤ کے کافی ہاؤس اور شام کی محبتوں کی جان تصور کیے جاتے تھے اور مجازؔ کے نہایت ہی قریبی دوست تھے انھوں نے اس زمانے کے مجازؔ کے متعلق لکھا ہے:۔

"مجازؔ سچ مچ زندگی سے اکتا چکا تھا۔ جن لوگوں نے اسے مشاعروں اور میخانوں میں دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں عنصر اس کے تیور تھے۔ مگر اب یہ

---

[1] یہ صاحب شعر و سخن کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور کبھی کبھی خود بھی شعر کہتے ہیں یہ شعر انھیں کا ہے

اب ڈھونڈیے تو اس کا نشاں بھی نہ پایئے
وہ موج جو سفینۂ دل کو [illegible]

تیور بدل بلکہ بگڑ چکے تھے۔ ان کی آنکھوں میں پیہم خمار اور ذہنی کشیدگی کے باوجود جو ایک عجیب و غریب طلسماتی تابندگی نظر آیا کرتی تھی اب مفقود ہو چکی تھی۔

"ان ملاقاتوں میں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اب اس کے پاس سوائے موت کے کچھ باقی نہیں رہا۔"

کراچی کے زمانہ قیام کا ایک دوسرا تاثر قرۃ العین حیدر کا ہے جو لکھنؤ کے زمانہ قیام میں دار السراج کے پڑوس میں رہتی تھیں انھوں نے لکھا ہے کہ ایک ڈنر ہونے والا تھا۔ "میزبان خاتون نے کہا سنا آج کل انڈیا سے مجاز و جاذ آئے ہیں ان کو بلایا جائے۔ ذرا دل چسپ رہے گا۔ یعنی ارادہ کچھ یہ تھا کہ ڈنر کے ساتھ بال روم ڈانس نہ کیا ترنم سے پڑھنے والے کے اشعار سن لئے۔ چنانچہ مجاز اور روشن صدیقی کو ترنت بلوا بھیجا۔ اس زمانے میں مجاز کی حالت بہت دگرگوں ہو چکی تھی بہر حال انھوں نے اپنی تازہ غزلیں سنائیں۔ مجمع فوج کے بہت اعلیٰ افسروں کا تھا۔ خیر وہ بچارے صبر و شکر کر کے مجاز کے شعر سنتے رہے اور مجاز صبر و شکر کر کے سناتے رہے مجمع کو سانپ سونگھا ہوا تھا بالآخر جہلم کے ایک میجر جنرل صاحب نے ان سے کہا۔

"جی اب آپ آسان سی غزل سنا دیجیے تو پھر ہم لوگ جلیں۔"!

اس قسم کا واقعہ تو خیر اونچے طبقہ کے ذہین شاعر کے ساتھ کہیں بھی پیش آسکتا ہے۔ لیکن مجاز کے الٰہ آباد کے دوست اور اردو نقاد مجتبیٰ حسین نے کراچی کے ایک ڈگری کالج کے بزم ادب کے مشاعرہ کا جو واقعہ لکھا ہے وہ افسوسناک

بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ مجاز سے کچھ لوگوں نے "آوارہ" پڑھنے کی
فرمائش کی۔ دو ایک بند انھوں نے سنائے مگر یہ نظم ان سے نہ چل سکی
اور انھوں نے اسے چھوڑ دیا اور بیٹھ گئے۔

"مختلف شعرا اپنا کلام سناتے رہے مگر مجاز کی باری نہیں
آئی۔ ہم لوگ سامعین کی صف میں پیچھے بیٹھے ہوئے تھے دیر تک
انتظار کرنے کے بعد مجاز کی باری نہ آئی تو ہم لوگوں کی طرف سے ان
کے پڑھائے جانے کے لئے آوازیں لگائی گئیں۔ بارے مجاز ڈائس
پر آئے۔ انھوں نے "اعتراف" سنانی شروع کی۔ وہ پڑھ نہیں پا رہے
تھے۔ ان کی سانس بار بار ٹوٹ جاتی اور وہ رک رک جاتے
انھیں مستقل کھانسی آ رہی تھی اور وہ ہر جھٹکے کے ساتھ سینہ تھام
لیتے۔ طلبا کا مجمع کچھ بے کیف اور بے چین ہوا جا رہا تھا بعض
گوشوں سے ہوٹنگ بھی شروع ہو چکی تھی مگر مجاز سامعین کی
اکتاہٹ سے بے خبر ہو کر پڑھے جا رہے تھے۔

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہر خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے

ان کی آواز میں ایک عجیب حزن آ گیا تھا۔ مجاز اپنی بربادی
کا مرقع بنے ہوئے نظم پڑھے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ مجمع کی بے چینی

؎ اندھیری رات کا مسافر (مجاز ایک آہنگ)

رک گئی۔ اور خاموشی چھا گئی۔ دفعتاً میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک طالب علم نے دوسرے سے پوچھا۔ "یہ کون شاعر ہے؟" معلوم نہیں اس نے کیا جواب دیا۔ کیا جانے اسے بھی معلوم رہا ہو یا نہ رہا ہو میں اس سوال کے بعد اور کچھ نہ سن سکا۔ زمانہ آشنا بدل گیا ہے اس کا احساس مجھے اسی وقت ہوا۔ جس مجاز کے نام پر بقول عصمت چغتائی لڑکیاں قرعے ڈالتی تھیں۔ آج اسے ایک درس گاہ کی ادبی محفل میں طالب علم جانتے بھی نہیں"۔ [1]

یہ وہ مجتبیٰ حسین ہیں جنھوں نے اس واقعہ سے کوئی دس گیارہ سال پہلے الہ آباد کے ایک مشاعرہ میں ایک اور ہی منظر دیکھا تھا۔ صفی لکھنوی مرحوم نے "آوارہ" کے ایک مصرعے پر مجاز کی پیشانی چوم کر داد دی تھی اور یہ بھول گئے تھے کہ ایک لمحہ قبل مجاز کے منھ سے آتی ہوئی شراب کی بو کے باعث ان کے لئے مجاز کے پاس بیٹھنا دشوار ہو رہا تھا۔ [2]

---

[1] مجاز ایک آہنگ

[2] یہ واقعہ بھی مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے۔

جنون کا تیسرا دورہ

پاکستان سے لوٹے تو پھر وہی چکر شروع ہو گیا۔ شراب، مشاعرے اور دہلی۔ لکھنؤ۔ الہ آباد۔ علی گڑھ اور دوسرے شہروں کے چکر۔ ایک بار لکھنؤ واپس ہوئے تو جنون کے تیسرے حملے کے آثار پوری طرح نمایاں تھے۔ یہ مارچ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ جوشؔ سے سخت ناراض تھے۔ ان سے غالباً کسی موقع پر کچھ بدمزگی ہو گئی تھی۔ جوشؔ نے ایک طویل نظم "پیغام برائے اصلاح میاں مجازؔ" لکھی اور "آج کل" میں چھاپ بھی دی۔ اس واقعہ کا ان پر سخت ردعمل ہوا۔ اور انھوں نے دو قطعات کے ذریعے اس طویل نظم کا جواب دیا۔ جس میں سے ایک قطعہ میں جوشؔ کے وزیراعظم کشمیر شیخ عبداللہ کی شان میں قصیدہ لکھنے پر طنز کیا تھا۔

نطق رسوا ذہن دریدہ ہے
یہ شنیدہ نہیں ہے دیدہ ہے
رند برباد کو نصیحت ہے
شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

دوسرے قطعہ میں جوش کی سرکاری ملازمت پر طنز تھا۔

پیرِ جوشِ شباب کیا جانے
شورشِ اضطراب کیا جانے
سینۂ انقلاب چھلنی ہے
شاعرِ انقلاب کیا جانے

سردار جعفری کا کہنا ہے کہ "یہ کیفیت کچھ ایسی لگی تھی کہ مجاز آخر وقت تک نہیں سنبھل سکا اور رانچی کے اسپتال میں جنونی کیفیت میں جو مصرعے لکھے تھے ان میں ایک مصرعہ یہ بھی تھا

"فراقؔ ہوں اور نہ جوشؔ ہوں میں، مجازؔ ہوں سرفروش ہوں میں"

لکھنؤ آئے تو جوش کے خلاف یہ دونوں قطعے بڑے ولولے کے ساتھ سناتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کسی کسی وقت بالکل بے ربط باتیں کرنے لگتے تھے۔ جنون کے اس دورے میں ان کے منہ سے جو جملے بار بار ادا ہوتے تھے انھیں ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔ ان کی ڈائری کے متعلقہ حصے مجاز کے انتقال کے بعد کچھ غیر مطبوعہ کلام کے ساتھ "نقوش" لاہور میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض جملے یہ تھے۔

"SOVIET EMBASSY SPEAKS,
CHINESE EMBASSY RELAYS"

"چار نوکریاں اور دو بیویاں مرے گرد گھوم رہی ہیں اب پھر دہلی جانا ہے ـــــ اور پھر بھگتنا ہے انھیں"۔

اسی حالت میں امن کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے کلکتہ پہونچے اور وہاں بھی خاصے ہنگامے کئے۔ اپریل میں لکھنؤ لوٹے تو جوش سے اور بھی زیادہ ناراض تھے اور برملا کہتے تھے کہ شاعر صرف دو ہیں ایک سبقتؔ اور دوسرا مجازؔ۔ ان دنوں ان کے منھ سے اکثر یہ جملے ادا ہوتے تھے۔

"جہاں پناہ ایران کا شہزادہ مراد حاضر ہے"

"ناشاد نامراد شہزادہ مراد کو حاضر کیا جائے"

"بس ہو چکے بہانے چلو جانے دو"

یہ شعر بھی بار بار پڑھتے تھے۔

دعویٰ زبان کا لکھنؤ والوں کے سامنے
تعریف بوئے مشک غزالوں کے سامنے

بیگم حمیدہ سالم نے ان دنوں کے بارے میں لکھا ہے۔

"گھر میں ٹکنا ہی گوارا نہ کیا۔ دلّی کے گلی کوچوں کی خوب خاک چھانی۔ بے خبری کے تماشے دلّی والوں نے خوب خوب دیکھے جس انسان نے عالم ہوش میں کبھی کوئی ذلیل اور گھٹیا حرکت نہ کی وہ ہر لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔"[1]

دہلی سے جوش ملیح آبادی نے مجاز کے گھر کے لوگوں کو لکھا کہ مجاز کو آگرہ کے پاگل خانے میں داخل کرادیا جائے۔ اس کے جواب میں بیگم حمیدہ سالم

---

[1] جگن بھیا

نے جوش صاحب کو لکھا کہ وہ اپنے اثرات سے کام لے کر رانچی میں مجاز کے لئے ایک بیڈ کا انتظام کرا دیں مگر جوش صاحب نے جواب نہ دیا۔ آخر خود بیگم حمیدہ سالم نے رانچی مینٹل ہاسپٹل کے انچارج ڈاکٹر ڈیوس کو خط لکھا اور انھوں نے مجاز کے لئے بی کلاس وارڈ میں ایک بیڈ دے دیا۔ ان کے چھوٹے بھائی انصار ہروانی انھیں مشاعرے کے بہانے رانچی لے گئے اور اسپتال پہونچ کر ان سے کہا کہ مشاعرہ ملتوی ہو گیا اور کسی نہ کسی طرح ان سے رخصت ہو کر لوٹ آئے۔ رانچی میں ان دنوں مشہور بنگالی شاعر قاضی نذرالاسلام بھی زیر علاج تھے۔

ایک سائیکلوجسٹ نے جو کچھ عرصہ قبل کسی کام سے رانچی گئے تھے اور جنھوں نے مجاز سے واقفیت کی بنا پر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجاز کے علاج سے متعلق ذاتی دلچسپی سے دیکھی بتایا کہ ڈاکٹر ڈیوس اور دوسرے معالجین نے مجاز پر تحلیل نفسی کے عمل کے بعد جو نتائج اخذ کئے تھے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ وہ بچپن میں شرمیلی طبیعت کی بنا پر کھل کر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے بہت سے جذبات دب کر ان کی شخصیت کے اندر ایک مایوس انسان کو جنم دے رہے تھے۔

۲۔ خاندانی ماحول جس قسم کا ملا اس میں بھی ان کے اندر کا جذباتی طوفان دبتا رہا۔

۳۔ یہ حالت انسان میں عالم طفلی کی طرف واپس جانے کے میلانات

کو جنم دیتی ہے۔ مجاز کے اندر عالم طفلی کی طلبیات Psychological
needs میں سے چاہے جانے کی تمنا کا عنصر غالب رہنے لگا۔
وہ ایک بچے کی طرح ہر بے رخی پر شکست یا مایوسیوں میں مبتلا ہو جاتے
ہیں پر چاہے جانے کی تمنا اور احساس کمتری آپس میں دست و گریباں ہو تے
ہیں اور مجاز اپنے دفاع ذہنی (Defence Mechanism
کے لئے مختلف طریقوں سے سماجی زندگی میں برتری حاصل کرنے کی کوشش کرتے
۴۔ یہ دفاع جب سہارا نہ دیتا تو ان کے اندر کی مسا کیت
masochis ابھرتی اور وہ خود کو ایذا پہونچا کر لطف اندوز ہوتے۔
۵۔ جنسی جارحیت کی کمی مختلف الجھنوں کا باعث بنی
رانچی میں تقریباً ۶ ماہ زیر علاج رہنے کے بعد وہ صحت یاب ہو کر
گھر لوٹے۔ سہیل عظیم آبادی ان کے ساتھ تھے۔ آل احمد سرور سے ملنے ان کے
گھر گئے تو کہنے لگے۔ "سرور صاحب! رانچی میں ایک ریسرچ کی ہے شراب
سے نشہ نہیں ہوتا آدمی پاگل ہو جاتا ہے" [1] ان کی واپسی کے بعد ان کی
بہن صفیہ اختر کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمے کا ان پر بڑا صحت مند اثر پڑا
اور وہ اچانک سنبھل گئے۔ سارا وقت جاں نثار اختر کے دونوں بچوں کے
ساتھ گزارتے شراب ترک کر چکے تھے اور تقریباً ۶ ماہ تک انھوں نے اس
زمانہ میں عام لوگوں کی جیسی زندگی بسر کی۔ لیکن ان کی اس ترک مے نوشی سے جو

---

[1] علی گڑھ میگزین مجاز نمبر

کی محفلیں سونی پڑ گئی تھیں وہ برابر ان کے پیچھے لگے رہے اور آخر انھوں نے پھر
شراب پینا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں ان کی حالت بڑی افسوسناک تھی
شراب نہ پئے ہوتے تو بالکل چپ چاپ اور اداس اور مایوس نظروں سے کافی
ہاؤس میں ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا کرتے اور شراب پی لیتے تو فوراً
ہی قابو سے باہر ہو جاتے۔ اس مرحلہ پر ایک اور دشواری آ پڑی۔ لکھنؤ میں
ان کے ادیب شاعر دوستوں کے حلقے کا شیرازہ بکھر چلا تھا اور اب انھیں شراب
پینے کے لئے ایسے لوگ ملتے تھے جو صرف شرابی تھے۔ شہر نگاراں کے لوگ اب
شاعر شہر نگاراں سے کترانے لگے تھے۔ ان کی مثال اب اس پتھر کی سی ہو کر رہ
گئی تھی جو چوٹی پر سے غار میں گرنے کے لئے تیزی کے ساتھ نیچے لڑھکتا چلا
آ رہا تھا۔

شام غریبانِ لکھنؤ

۳۰ دسمبر سنہ ۵۵ء کو لکھنؤ میں طالب علموں کی طرف سے اردو
کنونشن تھا اس میں شرکت کے لئے باہر سے متعدد ممتاز ادیب شاعر
ڈاکٹر علیم، عصمت چغتائی، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، ڈاکٹر
محمد حسن، نیاز حیدر وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ اس قسم کے اجتماعات اور
مشاعروں کے موقعوں پر مختلف شہروں کے ادیب شاعر کہیں اکٹھا ہوتے
ہیں تو شراب دوستی کی تجدید کا سب سے موثر ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس موقع
پر بھی یہی ہوا۔ اور مجاز نے مختلف لوگوں کے ساتھ ۳۰ دسمبر سے شراب نوشی
کا جو سلسلہ شروع کیا وہ ۴ دسمبر کو رات گئے تک تھوڑے تھوڑے وقفے
سے جاری رہا۔ ۳ دسمبر کی رات میں مشاعرہ ہوا۔ شراب کا دور چلا لیکن بہت
زیادہ نہیں پی گئی۔ مشاعرے میں مجاز نے بڑی سنجیدگی کا ثبوت دیا۔ محمود

۱؎ ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ (مجاز)

نظمیں غزلیں سنائیں اور خوب داد پائی۔ سردار جعفری کا کہنا ہے "اس روز لکھنؤ کے "دوستوں" نے مجاز کو گھیرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں کسی طرح بچا کر نکال لانے میں کامیاب ہو گیا۔[۲] ۴ دسمبر کو مجاز دن میں سردار جعفری اور ساحر لدھیانوی کے ساتھ ان کے ہوٹل میں رہے۔ سہ پہر کو یہ لوگ کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لئے چلے گئے اور مجاز ہوٹل میں رہے ساحر لدھیانوی نے ان کے لئے نفیس وہسکی خرید کر رکھ دی تھی اور شام کو لکھنؤ کے "دوستوں" کے ساتھ نہ جانے کا وعدہ لے لیا تھا۔[۳] لیکن یہ لوگ دیر سے لوٹے تو مجاز جا چکے تھے۔ ساڑھے نو بجے رات کو وہ لکھنؤ کے کچھ ادیبوں کو ملے تو نشے میں دھت تھے اور شراب کے لئے روپے مانگ رہے تھے۔ اس کے بعد انھیں ان کے وہ نئے "دوست" مل گئے جو انھیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ یہ لوگ لال باغ کے ایک دیسی شراب خانے میں پہونچے اور وہاں چھت پر سائبان کے نیچے ۳ بجے رات تک شراب کا دور چلتا رہا ان کے ساتھی کسی نہ کسی طرح وہاں سے اٹھ کر چلے آئے اور مجاز وہیں سردی میں کھلی چھت پر پڑے رہے۔ شراب خانہ بند ہو گیا اور کسی کو چھت پر ان کی اس عالم میں موجودگی کی خبر نہ ہو سکی۔ ۵ دسمبر کو دن میں شراب خانے والوں نے انھیں چھت پر بے ہوش پڑے دیکھا۔ ایک ڈاکٹر کو بلوایا جس نے ڈبل نمونیہ

۲۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں

۳۔ ،، ،،

تجویز کیا اور وہ خود دوپہر کے قریب مجاز کو بلرام پور اسپتال میں پہونچا گیا۔ یہاں بھی ڈاکٹروں نے ڈبل نمونیہ تجویز کیا اور انجکشن دینا شروع کیے۔ اس وقت تک کسی کو علم نہ تھا کہ یہ کون شخص ہے۔ اتفاقاً ردولی کی ایک عورت اپنی ماں کے ساتھ بلرام پور اسپتال گئی ہوئی تھی اس نے کسی طرح انھیں دیکھ کر پہچانا اور مجاز کے قریبی عزیز فریدالحق صاحب کو ٹیلی فون کیا وہ چپراسی کے ساتھ اسپتال پہونچے تو مجاز موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ انھوں نے چپراسی بھیج کر دارالسراج میں اطلاع کرائی اور والدین اسپتال پہونچے تو ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ شام کو گنگا پرشاد درما ہال میں جہاں کانفرنس ہو رہی تھی یہ خبر پہونچی اور متعدد ادیب شاعر اسپتال پہونچے تو آکسیجن دی جا رہی تھی۔ دماغ کی رگیں پھٹ چکی تھیں۔ آخر کار رات کو دس بج کر ۲۲ منٹ پر ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری، سید احتشام حسین، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری اور دوسرے متعدد ادیب شاعر موجود تھے جن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

۶؍ دسمبر کو شہر کے تمام اخبارات میں نمایاں طور پر یہ خبر چھپی اور ایک ہزار سے زائد سوگواروں میں دارالسراج کے سامنے اکٹھا ہو گئے۔ شام کو ۵ بجے کے قریب ایک بڑے مجمع کی موجودگی میں انھیں نشاط گنج کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس سے قبل لکھنؤ میں کسی شاعر کی موت پر نہ اتنا سوگ منایا گیا تھا اور نہ ہی اتنی کثیر تعداد میں ہندو، مسلمان

اور سکھ کسی شاعر کے جنازے میں شریک ہوئے تھے۔

۷ دسمبر ۵۵ء کی شام کو رفاہ عام کلب کے وسیع ہال میں تعزیتی جلسہ ہوا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں حیات اللہ انصاری، سردار جعفری، مشہور ہندی ادیب یشپال، عصمت چغتائی اور سجاد ظہیر نے تقریریں کیں۔ سب سے موثر تقریر عصمت چغتائی کی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر ان جملوں پر ختم کی:۔

"میں نے اکثر مجاز کو اس کی بعض عادتوں پر ڈانٹا اور کبھی غصے میں کہا "اس سے بہتر ہے کہ مجاز تم مر جاتے"۔ مجاز نے جیسے منھ پر طمانچہ مار دیا اور کہا "لو میں مر گیا تم اس کو اتنا بڑا کام سمجھتی تھیں"۔ [1]

---

[1] قومی آواز ۸ دسمبر ۵۵ء

جاز کی شخصیت

مجاز بڑی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ یہ دل کشی شاعر کی حیثیت
ان کی شہرت اور مقبولیت کی رہین منت نہ تھی بلکہ جیسا کہ حسن عسکری
یال ظاہر کیا ہے "مجاز نے کچھ ایسی طبیعت پائی تھی یا بنالی تھی کہ ان کی
متوجہ ہونے کے لئے ان کے کلام سے واقف ہونا ضروری نہ تھا۔[1] اور شاید
ا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان کی شاعری کی مقبولیت میں ان کی دل کش شخصیت
ی خاصا ہاتھ تھا۔ ان کی زندگی نے اردو والوں کے لئے ایک رومانی افسانے
ثیت اختیار کرلی تھی اور اس رومانی افسانے کے پس منظر میں ان کی نظمیں اور
ں ایک خاص رنگ اور مفہوم اختیار کرلیتی تھیں۔

اس دل کش شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بلاشبہ خاندانی روایات اور
بیت بھی بہت اہمیت رکھتی تھی جس کے نتیجے میں بعض بنیادی اوصاف ان

---

[1] مجاز اردو ادب کا افسانہ (شاعر شہر نگاراں)

کی ذات سے ہمیشہ کے لیئے وابستہ ہو گئے تھے اس کے ساتھ ہی خود ان کے اپنے رویہ اور اعلیٰ ظرفی نے بھی خاصا اہم رول ادا کیا۔ علی گڑھ کی طالب علمی اور دلی کی دونوں ملازمتوں کے دنوں کو چھوڑ کر جب شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت اور مقبولیت پورے شباب پر تھی اور زہرہ جبینوں کے شبستانوں سے لے کر اونچے طبقے کے ڈرائنگ روموں تک کے دروازے ان کے لئے وا تھے باقی تمام زندگی انھوں نے ایک لحاظ سے ناکامی اور محرومی میں بسر کی اور اپنے دوستوں اور ہم عصروں کو جن میں سے متعدد لوگ ان کی جیسی صلاحیتوں کے مالک بھی نہ تھے۔ زندگی کی دوڑ میں کامیاب و کامران اور اعلیٰ سرکاری عہدوں تجارتی فرموں یا کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اچھی جگہوں پر مامور ہوتے دیکھا۔ ان حالات میں وہ بداخلاق بھی ہو سکتے تھے۔ خود غرض بھی، یہ احساس شکست احساس کمتری کا روپ بھی دھار سکتا تھا اور وہ جھنجھلاہٹ اور چڑچڑے پن کا شکار ہو کر دوست احباب، عزیز و اقارب بلکہ سارے ماحول کو اپنا دشمن بھی تصور کر سکتے تھے لیکن ان کو قریب سے دیکھنے اور برتنے والے خواہ وہ ان کے عزیز ہوں یا ادیب شاعر یا آخری عمر کے شرابی دوست سب اس حقیقت کے معترف ہیں کہ ان میں سے ایک بھی ناقص رجحان ان کی شخصیت کو داغدار نہ کر سکا۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو شاہ معین الدین ندوی کے اس خیال سے اختلاف کریگے۔

"جہاں تک مجھے علم ہے شراب نوشی کے سوا جسے جتنا بھی برا کہہ لیا جائے اور کوئی اخلاقی برائی نہیں تھی۔"[1]

---

[1] شبستان لکھنؤ مجاز نمبر

ان کی زندگی آواز شکستِ ساز کی سی تھی مگر وہ ہمیشہ زمزمہ سنجی اور نغمہ خوانی پر مصر رہے۔ انھیں مسلسل شکستوں کا سامنا کرنا پڑا مگر زندگی کے متعلق ان کا رویہ ہمیشہ فتح مند انسان کا سا۔ یہ کسی معمولی ظرف کے انسان کے بس کی بات نہ تھی۔

مجاز کی ہمہ دل کش شخصیت کے کئی روپ تھے ایک روپ گھر میں نظر آتا تھا۔ ایک دوست احباب کے درمیان کافی ہاؤس کی محفلوں میں ایک بالکل ہی مختلف روپ بادہ خانوں اور شراب خانوں میں شراب کی میز پر اور ایک ادبی اجتماعات یا مشاعروں وغیرہ میں۔

۱۔ گھر کے افراد سے لگاؤ

گھر کے معاملات میں سوا ان لمحات کے شراب اثر پر غالب ہو
تھا مجاز کا رویہ عموماً ذمہ دارانہ ہوتا تھا۔ ماں باپ سے محبت اور ان
شدید احترام اور بھائی بہنوں سے اور ان کے بچوں سے گہرا لگاؤ ان کی شخص
کا جزو تھا والدہ سے ان کی محبت عشق کی حد تک پہونچی ہوئی تھی اور
جیسے احساسات کا احساس رہتا ہو کہ وہ ان کی توقعات پر پورے نہیں
اترے اور کسی نہ کسی طرح اس کی تلافی ہونی چاہیئے۔ بعض اوقات عا
کیف و مستی میں بھی کہیں کسی شراب خانے میں انھیں اچانک ماں یاد آجا
تو جانے کس احساس ندامت یا احساس محبت سے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو
لگتے ان کے ایک دوست اور اردو نقاد مجتبیٰ حسین نے اس قسم کا ا
واقعہ بیان کیا ہے۔

غالباً سنہ ۱۹۴۶ء میں پہلی میری ان سے الہ آباد ہی میں ملاقا
ہوئی۔ یہ ملاقات بھی فراق صاحب کے یہاں ہوئی۔ شام کے وقت جب

ا فراق صاحب کے یہاں پہونچا تو مجاز کھڑے ہوئے بہک رہے تھے۔ وہ
لی کے اشارے سے فراق صاحب سے بار بار کہہ رہے تھے۔ فراق صاحب
ب ہم تمھیں اپنی طرف بلائیں گے تو تمھیں آنا پڑے گا۔ آنا پڑے گا۔" فراق
احب مجاز کی اس جذباتی حرکت سے بہت پریشان تھے مجھے دیکھ کر انھیں
ہارا ملا۔ انھوں نے حکم دیا کہ میں کسی طرح انھیں یہاں سے لے جاؤں بدقت
م کسی طرح سمجھا بجھا کر انھیں یہاں سے ہٹالے جانے میں کامیابی ہوگئی۔ رام
ہن لال کے چوراہے پر پہونچ کر جب تانگہ چلا تو ان پر ایک اور دورہ پڑا
ہ دفعتاً رونے لگے کہنے لگے مجتبیٰ میں بہت خراب ہوگیا ہوں مگر اس پر بھی
یری ماں جب میں پہونچتا ہوں تو میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیتی ہے" روتے
تے نہ معلوم کیا سوجھی، کہنے لگے" جب میکسم گورکی کی ماں ہو سکتی ہے تو میری
اں بھی ہو سکتی ہے" اور تقریباً چیخ کر مجھے حکم دیا۔ کہو ماں! چنانچہ ہم
ونوں نے "ماں، ماں" کے نعرے لگانے شروع کئے۔ یہ نہ کرتا تو ممکن تھا تانگے
ے اتر جاتے اور شارع عام پر ہی چیخنے لگتے۔ رات ہو چکی تھی سڑکوں پر
ڑی بھیڑ تھی۔ ہم دونوں "ماں" کا نعرہ لگاتے گزر رہے تھے [1]

یہ "ماں، ماں" کی دردناک آواز راتوں کے سناٹے میں الہ آباد کی
طرح دہلی اور بمبئی کی سڑکوں پر بھی یقیناً گونجی ہوگی جہاں تک لکھنؤ کا تعلق ہے
یہاں رات گئے لال باغ اور حضرت گنج کے میکدوں میں بارہا سنی گئی ہے اور

---

[1] مقالہ مغنی آتش فشاں (مجاز ایک آہنگ)

حضرت گنج سے نیو حیدر آباد تک، گومتی کے پل کے اوپر سے گزرتی ہوئی شاہراہ یونیورسٹی روڈ پر بھی ایک دو بجے رات کو یہ دردناک چیخ بارہا سنائی دیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی یہ چیخ ان کے کسی قریبی دوست یا عقیدت مند نے سنی اور آبدیدہ ہو گیا اور کبھی کسی شرابی نے سنی جس نے درد کی اس لہر کو قہقہوں کے طوفان میں بہا دیا۔

والدہ سے مجاز کی شدید محبت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے طوفان کے درمیان وہ ۱۹۵۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو میں ایم اے کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کیوں کہ والدہ کی خواہش تھی کہ وہ ایم اے کر لیں۔[1]

والد کے احترام کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے نہ کلام سناتے نہ سگریٹ پیتے۔ یہ بھی خواہش رکھتے تھے کہ ان کی زندگی کے قصے کوئی ان کے والد تک نہ پہونچائے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شوکت تھانوی نے مجاز کے والد سے مجاز کا ذکر کرتے ہوئے بہت سی تعریفوں کے بعد آخر میں یہ کہہ دیا کہ مجاز کو شراب نوشی کی عادت پڑ گئی ہے کسی طرح سے چھڑائیے۔ یہ خبر مجاز تک بھی پہونچی بہت خفا ہوئے اور اکثر دوستوں سے

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن کی ڈائری کے اوراق "نقوش" مارچ ۵۶ء

شوکت صاحب کی شکایت کی اور کہا "میں نے شوکت صاحب سے کہہ دیا ہے کہ وہ یا تو میرے والد سے دوستی رکھیں یا مجھ سے بیک وقت باپ بیٹے دونوں سے دوستی مناسب نہیں" وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے گھر والوں کو ان کی شراب نوشی کا علم ہے نہیں چاہتے تھے کہ اس برے کام کا تذکرہ ان لوگوں سے کیا جائے۔[1]

وہ اپنی بہنوں سے بھی بہت محبت کرتے تھے بڑی بہن عارفہ خاتون کے انتقال (۲۰ جون ۱۹۵۱ء) پر انھوں نے اپنے رنج و غم کا اظہار ایک قطعے میں کیا جس کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

اک اشارے سے اجل کے دفعتاً
رک گیا ہے زندگی کا کارواں

یہ وہ زمانہ تھا جب مجازؔ شاعری تقریباً ترک کر چکے تھے اور کبھی کبھار ہی کچھ لکھتے تھے اس حقیقت کو ذہن میں رکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ بہن کے انتقال پر ان کا یہ قطعہ لکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں دلی صدمہ پہنچا ہوگا ورنہ قطعہ لکھنے کی نوبت نہ آتی۔

دوسری دونوں بہنوں صفیہ اور حمیدہ سے بھی انھیں بہت محبت تھی۔ بیگم حمیدہ سالم نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ وہ ان کی تعلیم سے بہت گہری دلچسپی رکھتے تھے اور یہ دلچسپی گہری محبت کی آئینہ دار تھی۔

---

[1] مجازؔ ایک آہنگ

صفیہ اختر مرحومہ سے ان کی محبت کا تذکرہ ان کے شوہر جاں نثار اختر نے گوالیار کے ایک واقعے کے سلسلے میں بڑے موثر انداز میں کیا ہے[۱] گوالیار میں مجاز کو جاں نثار اختر نے ایک مشاعرے میں مدعو کیا تھا۔ شام کو شراب کے نشے میں باتیں کرتے کرتے جانے کس طرح صفیہ کا ذکر چل نکلا۔ مجاز نے یکبارگی جاں نثار اختر سے کہا: "اختر، صفیہ کو بلاؤ" حالانکہ وہ کبھی پی کر صفیہ کے سامنے آنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ صفیہ مرحومہ نے یہ کہہ کر کہ انھوں نے کبھی مجاز کو اس عالم میں دیکھا ہے اور نہ ہی اس کی تاب رکھتی ہیں ان لوگوں کے کمرے میں آنے سے انکار کر دیا۔ مجاز یہ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ آخر اسی عالم میں مجاز بغیر کھانا کھائے بستر پر پڑ کے سو گیا۔ اور صفیہ اس کے سرہانے اس کے سر پر ہاتھ رکھے رات بھر چپکے چپکے روتی رہی۔"

بہنوں اور ان کے بچوں سے شدید محبت کی ایک اور مثال اسی واقعہ کے کئی سال کے بعد اور مجاز کے انتقال سے ڈیڑھ دو سال قبل کی ہے یہ ان دنوں کی بات ہے جب ان کا وجود جل بھن کر راکھ ہو چکا تھا اور جنون کے آخری حملے کے بعد رانچی میں علاج کرا کے وہ لکھنؤ واپس لوٹے تھے ان کے گھر پہونچنے کے ایک مہینہ بعد صفیہ اختر کا انتقال ہو گیا اس وقت مجاز کے اندر اپنی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو گیا اور وہ اپنے غموں کو بھول کر بچوں کی دل جوئی میں مصروف ہو گئے۔

---

[۱] "صفیہ کو وہ بہت چاہتا تھا" جاں نثار اختر (مجاز ایک آہنگ)

"اس صدمہ کا اثر بجلی کے شاک کا ہوا۔ جیسے ایک دم چونک پڑے ہوں ایک دفعہ پھر ان میں ذمہ داریوں کا احساس چمکا۔ جادو۔ ادیس (صفیہ مرحومہ اور جاں نثار اختر کے بچے) کی پڑھائی اور دیگر مشغلوں میں دل چسپی لینا ان کی دلجوئی کرنا زیادہ تر وقت گھر پر گزارنا شراب سے قطعی پرہیز۔ بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے لقمے بنا بنا کر سب میں بانٹتے" [1]

یہ محبت اور خلوص صرف بھائی بہنوں یا ان کے بچوں تک ہی محدود نہ تھا۔ دوسرے عزیزو اقارب سے بھی اسی بے پناہ خلوص کے ساتھ پیش آتے تھے۔ چنانچہ ان کے عزیز فرید الحق صاحب سے اس مقالے کی تیاری کے لئے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں بات چیت ہو رہی تھی تو انھوں نے متعدد بار ان کی شخصیت کے اس تابناک پہلو پر زور دیا اور کہا کہ ان کی خوش اخلاقی اور بے پناہ خلوص کے تمام عزیزو اقارب معترف تھے۔ اور شراب نوشی کے سوا اور کوئی خامی ان میں نہیں تھی۔

---

[1] جگن بھیا۔ از بیگم حمیدہ سالم

کافی ہاؤس کی شامیں

گھر کی زندگی سے باہر مجازؔ کی شخصیت کے دو اہم روپ قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں اجاگر ہوتے تھے علی گڑھ اور دلیؔ کے بعد ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ لکھنؤ میں گزرا یہاں حضرت گنج کا اولڈ انڈیا کافی ہاؤس "نیا ادب" کے زمانے ہی سے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کا مرکز تھا۔ آزادی کے چند برس قبل سے لے کر بعد کے کئی برسوں تک۔ اس کافی ہاؤس میں صبح سے شام تک "دانش وروں" کی بھیڑ سی لگی رہتی تھی ان میں سیاسی کارکن اور لیڈر، ڈاکٹر، وکیل، یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ، مصور، ہندی اردو کے شاعر اور ادیب، سیاست اور ادب سے دل چسپی رکھنے والے تاجر بھی ہوتے تھے۔ یہاں ایسے بے حد مصروف لوگ بھی آتے تھے جو نصف گھنٹے گپیں لڑا کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور ایسے بے فکر بوہیمین قسم کے لوگ بھی جو صبح سے شام تک ایک میز سے دوسری میز پر اور ایک گروہ کے اٹھ جانے کے بعد دوسرے گروہ کے لوگوں کے ساتھ

بیٹھ کر وقت گزارتے، کافی کا دور چلتا رہتا، سگریٹوں کا دھواں فضا
میں بلند ہوتا رہتا اور بلند آواز میں ہونے والے سیاسی اور ادبی مباحثوں
اور زوردار قہقہوں کے باعث ہر وقت سبزی منڈی کا سا شور بلند ہوتا
رہتا۔ شام کو خاص طور سے بڑی بھیڑ ہوتی۔ مگر اس کافی ہاؤس میں ایک
خاص قسم کے لوگ ہی اکٹھا ہوتے تھے۔ اسی لئے اس زمانے میں اس کا نام (انٹلیکچول
کافی ہاؤس) پڑ گیا تھا۔ سارے کے سارے چہرے جانے پہچانے ہوتے
تھے اور روز آنے جانے والے ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتے
تھے۔ کافی ہاؤس کے ماحول پر ایک نظر ڈالنے کے بعد مختلف میزوں کے گرد
بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں اور آوازوں کی بنا پر یہاں پابندی کے
ساتھ آنے جانے والے بڑی آسانی سے بتا سکتے تھے کہ کس میز پر سیاسی بحث
چھڑی ہے، کہاں نظم سنائی جا رہی ہے، کہاں یونیورسٹی کی سیاست زیر بحث
ہے، کہاں ہنسی مذاق اور محض جملے بازی میں مقابلہ ہو رہا ہے اور کہاں
اداسی اور محرومی کے ستائے ہوئے لوگ بوریت کے عالم میں چپ چاپ
بیٹھے اس سارے ہنگامے کو قلندرانہ بے حسی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

دراصل یہ سارا حلقہ بے حد ذہین، پڑھے لکھے، باشعور اور
باخبر لوگوں کا حلقہ تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ بائیں بازو کے رجحانات
رکھتے تھے۔ کسی قسم کی تنگ نظری انھیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ گھٹیا اور سطحی
قسم کی باتیں ہنسی مذاق میں بھی جائز نہیں تصور کی جاتی تھیں۔ سیاست، ادب،
زندگی، ساری باتوں اور سارے نظریوں میں اختلافات کی صورتیں بھی

سامنے آتی بعض تکرار کی نوبت بھی آجاتی تھی مگر تمام اختلافات، مباحثوں اور لڑائی جھگڑوں تک کی سطح ایک لحاظ سے علمی نوعیت کی ہوتی چنانچہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ کسی تلخ مباحثے کے باعث آپس میں بات چیت کا سلسلہ بند ہوگیا ہو۔

مجاز ۱۹۵۲ء تک بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جنون کے آخری حملے تک اس حلقے میں بے حد مقبول تھے اور اس کافی ہاؤس کی شاموں کے پس منظر میں ان کی باغ و بہار شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ ابھرتی تھی۔ یہیں غالباً ۴۵ء یا ۴۶ء میں راقم الحروف کو ان سے نیاز حاصل ہوا اور شعر و ادب سے دلچسپی کے باعث کافی ہاؤس کے اس ادبی حلقے سے بعد کے برسوں میں واقفیت اور قربت کے مواقع میسر ہوئے ان دنوں وہ کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنے تھے کرتے پر کبھی جواہر کٹ صدری پہنے ہوئے کبھی شیروانی پاؤں میں عموماً پشاوری چپل ہوتی تھی اور جیب میں قینچی سگریٹ کا پیکٹ لمبے لمبے بال بار بار پیشانی پر آجاتے تھے جن میں وہ اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے مسلسل کنگھی کرتے رہتے۔ وہ ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے جوان تھے اور ایسی پرکشش شخصیت کے مالک کہ کسی کو ان کا وجود بار نہ ہوتا!

آزادی کے بعد جب وہ مستقلاً لکھنؤ میں مقیم تھے عموماً شام کو نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر گھر سے نکلتے اور محمد حسن[۵] کے یہاں پہونچتے

۵؎ ڈاکٹر محمد حسن ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

جوان دنوں ریسرچ کر رہے تھے اور ان کے نیو حیدرآباد۔ مکان دارالسرور سے قریب ہی کالون کالج کے اساتذہ کے رہائشی کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر میں مقیم تھے۔ یونیورسٹی روڈ سے یہ دونوں خاصا طویل فاصلہ پیدل طے کر کے حضرت گنج آتے اور کافی ہاؤس میں جم جاتے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ مجاز دوپہر ہی کو گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور اکیلے کافی ہاؤس آجاتے۔ شام تک وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا تو وہ اٹھ کر اپنے ان دوستوں کے پاس سکریٹریٹ کی طرف چلے جاتے جو اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے مثلاً ذوالنورین مرحوم، جمال رضوی صاحب، علی جواد زیدی یا عباد الانصاری وغیرہ اور شام کو کافی ہاؤس لوٹتے۔

مجاز کافی ہاؤس کے ادبی اور سیاسی مباحثوں میں زیادہ سرگرمی سے حصہ نہیں لیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ خاموش بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہتے تھے لیکن بیچ بیچ میں ایسے برمحل فقرے چست کر دیتے کہ سنجیدہ اور بعض اوقات تلخ مباحثوں کا ہیجان قہقہوں میں بدل جائے۔ ان کے یہ فقرے یاد رکھے اور بار بار دہرائے جاتے اور یہی بعد میں مجاز کے لطیفوں کی حیثیت سے شہرت پاتے۔ مگر جو لوگ ان دنوں مجاز سے زیادہ قریب تھے انھیں ان لطیفوں کو محفوظ رکھنے کے خیال سے لکھ لینے کا کبھی احساس بھی نہ ہوا۔ دراصل اس قسم کے لطیف یا طنزیہ جملے اکیلے مجاز ہی کے منھ سے ادا نہ ہوتے تھے اس ادبی اور سیاسی حلقے کے زیادہ تر لوگ بڑا خوش گوار sense of humour رکھتے تھے۔ مجاز کے لطیفوں کو محفوظ رکھنے کی فکر

کون کرتا۔ مجاز کے اس قسم کے جملے ان کے اس زمانے کے قریبی ترین دوست
نصیر جیلانی[۱]، شوکت صدیقی[۲]، ڈاکٹر محمد حسن، سلام مچھلی شہری، احسن
شہیر[۳] اور کمال احمد صدیقی[۴] وغیرہ کی موجودگی میں ادا ہوتے
تھے لیکن کبھی ان لطیفوں کو محفوظ رکھنا یا ان کے متعلق کوئی مضمون لکھنا
ان میں سے کسی کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کے
انتقال کے بعد ادھر ادھر مختلف مضامین میں ان کے نام سے جو لطیفے شامل
ہوئے ان میں ان کے سب سے اچھے لطیفے شامل نہ ہو سکے جنھوں نے حضرت
گنج کے اولڈ لوائنز کافی ہاؤس کی شام کی نشستوں میں جنم لیا تھا ——
آل احمد سرور نے جو اس ادبی حلقے کی جان تھے علی گڑھ میگزین کے مجاز
نمبر میں ان میں سے دو ایک کا تذکرہ کیا ہے اسی قسم کا ایک اور قصہ اس
وقت ذہن میں آتا ہے۔ سلام مچھلی شہری نے بعض اہم ادبی و سیاسی
شخصیتوں کے نام منظوم خطوط لکھنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ سلام کا
یہ زمانہ تخلیقی اعتبار سے بڑا زرخیز تھا اور وہ تقریباً ہر روز کوئی نظم
غزل لکھتے تھے۔ ایک روز کافی ہاؤس میں ان کے ان منظوم خطوط کا ذکر

---

۱ یہ صاحب ان دنوں "ڈان" کراچی سے وابستہ ہیں۔
۲ مشہور افسانہ نگار جو کچھ عرصہ قبل تک اخبار "انجام" کراچی کے
نیوز ایڈیٹر تھے۔ ۳ اردو شاعر جو ان دنوں سیلس ٹیکس افسر ہیں۔
۴ اردو شاعر، ان دنوں سری نگر ریڈیو سے وابستہ ہیں۔

چل نکلا لوگ مذاق اڑانے لگے کہ صاحب جو لوگ لکھنؤ ہی میں مقیم ہیں اور جن
سے روز ملاقات ہوتی ہے ان کے نام خط لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟
سلام کو غصہ آگیا اور انھوں نے بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ آپ کے
دیکھنا ڈاکٹر علیم کے نام جو خط لکھ رہا ہوں وہ کتنا شاندار ہوگا مجاز
فوراً بول اٹھے "سلام تم علیم صاحب کو خط لکھنے کے بجائے ان کا
خط بنا دو" (علیم صاحب کی فرنچ کٹ داڑھی ذہن میں رہے)

اس کافی ہاؤس اور ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں
کے اسی حلقے کے پس منظر میں مجاز کی شخصیت کے وہ جوہر خاص طور سے
نمایاں ہوتے تھے جن کا تذکرہ ان کی شخصیت پر اظہار خیال کرنے والے
اکثر ادیبوں شاعروں نے کیا ہے۔

"مجاز سراپا محبت تھا۔ نفرت کرنا تو اسے آتا ہی نہ تھا
ساری زندگی اس نے کسی کا برا نہ چاہا۔ بجز اپنے کسی کی ذات کو
اس نے نقصان نہ پہنچایا بجز اپنی ذات کے۔ بہت ہوا تو مذاق
اڑا دیا، فقرے چست کر لیے، دل کی بھڑاس نکل گئی۔ غصہ اسے
شاید ہی کبھی آتا ہو۔ ایسا تو نہ تھا کہ کوئی بات اسے ناگوار ہی
نہ گزرتی ہو مگر اعصاب کی کمزوری کے باوجود اس میں ضبط
کرنے اور اپنے جی کو مارنے کی طاقت بھی بہت زیادہ تھی دوستوں
کی محفل جمی ہوئی ہے، بحث ہو رہی ہے اشتعال انگیز باتیں کی
جا رہی ہیں مگر مجاز مشتعل نہیں ہوتے اس کے اوپری ہونٹ میں خفیف

سمالزرش ہوتی ہے یا نجھے پھڑکنے لگتے ہیں ۔ ناگواری کا اس سے زیادہ احساس اس کے بس کی بات نہ تھی۔" [1]

"نیا ادب" دور کے بعد ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ لکھنؤ میں ایک نئے ادبی دور کا آغاز ہوا تھا یہ محفلیں تقریباً ۱۹۵۵ء تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہیں ۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہ بڑا ہیجانی زمانہ تھا ادبی رقابتیں ترقی پسندوں میں بھی اور ان غیر ترقی پسندوں میں بھی جو کافی ہاؤس کے حلقے سے وابستہ تھے پورے شباب پر تھیں ۔ لوگ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے سے بھی باز نہیں رہتے تھے ۔ مجاز کو بعض لوگ طنز کا نشانہ بناتے تھے اور بعض شاعر اس معاملے میں "عذر مستی" کا بھی سہارا لیتے تھے لیکن مجاز کو کبھی کسی نے اپنے ان دوستوں یا کسی دوسرے ادیب شاعر پر غصہ ہوتے نہیں دیکھا ۔ وہ کسی کی کامیابی سے جلتے تھے نہ کسی کی ناکامی پر بد تمیزی کے ساتھ مذاق اڑاتے تھے جو ادیب شاعر عمر یا ادبی مرتبے میں ان سے بڑے تھے ان کا احترام کرتے تھے ــــــ کافی ہاؤس میں آل احمد سرور، ڈاکٹر علیم، پنڈت آنند نرائن ملا یا سید احتشام حسین داخل ہوتے اور ادیبوں شاعروں کی میز کی طرف آتے تو مجاز بھی دوسروں کے ساتھ احتراماً کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کرتے تھے ، جو ان سے چھوٹے تھے ان کی تخلیقات شوق سے سنتے ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور کسی سے تعارف کراتے تو تعریفی کلمات استعمال کرنا کبھی نہ بھولتے ۔

---

[1] سبط حسن (صہبا لکھنوی کے نام ایک خط) مجاز ایک آہنگ

عالمِ یاس میں کیا چیز ہے اک ساغرِ مے ؎

مجاز کی شخصیت کا وہ روپ جس کے لیے اردو میں بانکپن سے زیادہ
پُر نور لفظ تلاش کرنا سخت مشکل ہے۔ میکدوں اور شراب خانوں میں نظر
آتا تھا۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن اور تیور ملتا ہے۔ اپنے ماحول پر چھا جانے
کا ارادہ رکھنے والے شاعر کے جس عزم اور اعتماد کی جھلک ملتی ہے وہ بانکپن اور
وہ عزم اور اعتماد ان کی زندگی میں اگر کہیں نظر آتا تھا تو صرف شراب کی
میز پر دوست احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے مجاز میں۔

لکھنؤ میں نیا ادب کے حلقے کے ادیب شاعر جن دنوں اکٹھا بیٹھے انھیں
یاد کرتے ہوئے اس حلقے کے ایک رکن فرحت اللہ انصاری نے لکھا ہے۔

"جب ان دنوں کا خیال آتا ہے تو ایک بات جو رہ رہ کر
یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے پیتے تھے تو پیتے ہی ان کی رقابت

؎ عالمِ یاس میں کیا چیز ہے ایک ساغرِ مے — دشتِ ظلمات میں جس طرح خضر کی قندیل
(مجاز)

اور کثیف قسم کے لوگ بھی اور کبھی کبھی تو اس زور و شور سے کہ ساری محفل درہم برہم ہو جاتی تھی مگر مجاز جتنی ہی پیتا جاتا اتنی ہی اس کی محبت اور شرافت عود کرتی جاتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے محبت کا ایک سرچشمہ ہے جو پھوٹا پڑتا ہے۔

"جن لوگوں نے مجاز کو صرف آخری دنوں میں پیتے دیکھا ہے جب اس کے دوست صرف پہلوان قسم کے پینے والے رہ گئے تھے وہ اس پر حیرت کریں گے مگر انھوں نے اس مجاز کو دیکھا ہے جو ٹھوکریں کھاتے کھاتے بے جان ہو چکا تھا اس مجاز کو دیکھا ہی نہیں جس کا دعویٰ تھا۔

"میں ہر محفل کی رونق ہوں میں ہر گھر کا اجالا ہوں" [1]

مجاز شام کو کافی ہاؤس سے اسی قسم کی کسی محفل کے پروگرام کے تحت جو حضرت گنج لکھنؤ کا جنپیڈر، جانا بار، کیبورس یا کیپر لال باغ کے میجسٹک ہوٹل کے کیبنوں میں جمتی تھی اٹھتے تو ان کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک نمودار ہوتی تھکن اور بے حسی کی کیفیت دور ہو جاتی، چال میں تیزی آجاتی، جلدی جلدی باتیں کرنے لگتے اور اتنی ہی جلدی جلدی بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے جاتے۔ اس تیزی اور مسرت کے جواز کا اظہار اکثر یہ کہہ کر کرتے "اب شب پروانگی ہے"۔ شراب کی میز پر ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہو

---

[1] شاعر محفل وفا، مطرب بزم دلبراں (قومی آواز مجاز نمبر)

تھی کہ مرکزی کردار ان کی ذات رہے۔ جب تک موڈ اچھا رہتا اور بہت زیادہ
نشے میں نہ ہوتے بڑی پر لطف باتیں کرتے یہ باتیں عموماً شعر و شاعری کے متعلق
ہوتی تھیں) اور ان باتوں کے دیر تک خوشگوار طریقے پر جاری رہنے کا انحصار اس
بات پر ہوتا کہ ان کے ہم پیالہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ ان کے قریبی دوست جو سب کے
سب یا تو شاعر تھے یا شعر و سخن کے دلدادہ، موجود ہوتے تو وہ اختر شیرانی
جوش اور فراق کا تذکرہ ضرور کرتے جن کے بے شمار اشعار انھیں یاد تھے۔ ان
شاعروں کے اشعار سناتے خود سر دھنتے اور دوسروں سے داد کے طالب ہوتے۔ بات
خوشگوار طریقے پر بڑھتی رہتی تو اقبال تک پہونچ جاتی یا پھر کبھی میر و غالب یا
کسی دوسرے شاعر کے اشعار سناتے مگر جیسے ہی محسوس کرتے کہ لوگ بور ہونے لگے
ہیں ویسے ہی کسی سے شعر سنانے کی فرمائش کر دیتے یا کسی کی فرمائش پر خود اپنا کلام سنانے لگتے۔

جو لوگ ان کے ساتھ بادہ و جام کی ان محفلوں میں شریک رہے
ہیں ان میں سے متعدد افراد نے رائے ظاہر کی کہ پوری نشست میں ان کی دلی
خواہش رہتی تھی کہ سارے معاملات ان کی مرضی کے مطابق انجام پائیں۔ شراب
کی کمی زیادتی کا احساس کسی نہ کسی حد تک انھیں بھی رہتا تھا مگر بولا ہو گی کا مظاہرہ
وہ کبھی نہیں کرتے تھے جیسے جیسے نشہ چڑھتا ویسے ویسے ان کے رویہ میں تبدیلی کے
آثار نمایاں ہوتے کلام سنانے والے کسی شاعر کو اس کا ہاتھ یا پیشانی چوم
کر داد دینا ان کی محبوب عادت تھی۔ خود اپنے اشعار کی داد پر مسرت کا
اظہار بھی دوستوں کے ہاتھ یا پیشانی چوم کر کرتے تھے۔ کبھی کبھی اس بزم نشاط
میں بھی ان پر مایوسی کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ وہ بے حد اداس نظر آنے لگتے جانے

کیسے ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ ان سے کوئی بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے اور وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر لوگوں سے معافی مانگنے لگتے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا ان میں ضد کا مادہ ابھرنے لگتا۔ لوگ چاہتے کہ اب اٹھیں اور باہر نکلیں تاکہ بار میں کسی ناخوشگوار صورت کی نوبت نہ آئے مگر وہ دیر تک بیٹھنے پر مصر ہوتے اپنے گلاس میں ذرا سی شراب بچا رکھتے اور شدید نشے کے عالم میں بھی اسے بچائے رکھنے کی کوشش کرتے اسے ختم کر کے اٹھنے کو کہتے مگر گلاس ہونٹوں کے قریب نہ لے جاتے۔ دراصل اس کی ان میں سکت ہی نہ ہوتی تھی۔ ایک عجیب ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی جو دوسروں کی نشے کی حالت سے بالکل مختلف ہوتی عصمت چغتائی کے الفاظ میں ایسے موقعوں پر ان کی زبان قینچی کی سی تیزی سے مسلسل چلتی رہتی اور مستقل کپکپی تاری میں ان کے گلاس کی شراب گر کر میز یا فرش پر پھیل جاتی۔ لوگ ایک ایک کر کے چھوٹ لیتے۔ مجاز بدقت تمام باہر نکلتے۔ کوئی ساتھ رہ جاتا تو اس کے ساتھ ورنہ اکیلے ہی سڑکوں پر مارے مارے پھرتے۔ کبھی خود رکشے پر بیٹھ کر گھر چلے جاتے۔ کبھی کوئی جاننے والا مل جاتا اور وہ زبردستی انھیں رکشے پر بیٹھا رکشے والے کو گھر کا پتہ بتا دیتا۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ رات کو گھر نہ پہونچتے۔ گھر کے لوگ دروازے بند کر کے سو جاتے صرف ان کا کمرہ جو باہر کے حصے میں تھا کھلا رہتا۔ یہاں ان کے لئے کھانا، پانی اور سگریٹ کا ایک پیکٹ اور ماچس رکھی رہتی تھی۔

مجاز اس شراب نوشی کے سلسلے میں کافی بدنام ہوئے۔ شراب نے ان کے جسم کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا اور آخر کار شراب ہی نے ان کی جان بھی لی مگر ان

جاننے والوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ بدمستی کے عالم میں بھی جب انھیں سر پیر کا ہوش نہیں رہتا تھا بعض باتوں کو حتی الامکان نبھاتے تھے مثلاً کسی کی توہین نہیں کرتے تھے۔ کسی کو گالی نہیں دیتے تھے کسی کی شاعری کو حقیر نہیں قرار دیتے تھے کوئی بھی ایسی بات نہیں کرتے تھے۔ جو عام حالت میں تہذیب سے گری ہوئی تصور کی جاتی اس عالم میں بھی بزرگوں کا جتنا احترام کرتے تھے اس کا ایک قصہ آل احمد سرور نے اپنے مضمون[1] میں بیان کیا ہے جب وہ رات گئے پنڈت کیفی کے پاؤں دبانے پر اصرار کر رہے تھے چھوٹوں کا بھی اتنا ہی خیال رکھتے تھے۔ ان کے جو عقیدت مند اور دوست یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور شراب نہیں پیتے تھے۔ (مثلاً ڈاکٹر محمد حسن) ان سے کبھی شراب پینے پر اصرار نہیں کیا جن کے حالات خراب ہوتے تھے ان سے کبھی شراب پلانے کی فرمائش نہیں کرتے تھے۔ زندگی کے دوسرے معاملات کی طرح شراب کے معاملے میں بھی خود غرضی انھیں دور سے چھو بھی نہیں گئی تھی کبھی ریڈیو پروگرام یا کسی مشاعرے سے رقم ملتی تو ایک ہی رات میں دوستوں کے ساتھ جشن منا کر لٹا دیتے تھے۔

---

[1] مجاز۔ رومانیت کا شہید (علی گڑھ میگزین مجاز نمبر)

۴۔ مشاعروں میں

مشاعروں کے وہ دس پندرہ منٹ جبکہ مجازؔ مائیکروفون کے سا
رہتے تھے ان کی شراب نوشی کی عادت کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ا
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ مشاعروں کے ہنگاموں سے الگ رہتے تو شراب
غالباً ان پر اس بری طرح حاوی نہ ہوتی یہ مشاعرے دراصل اردو کے بعض
دوسرے شاعروں کی کثرت شراب نوشی کا باعث بنتے رہے ہیں ہر قسم کے
افراد پر مشتمل ہزاروں کے مجمع کا سامنا کرنا اور پھر ان پر چھا جانے کا جذبہ
دوسروں کی طرح بلکہ دوسروں سے شاید کچھ زیادہ ہی مجازؔ کی شخصیت کا
ایک اہم جزو تھا۔ ان کی شاعری کے اندر "میرا یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا ک
ہوں میں" والی جو شخصیت ملتی ہے وہ مجاز زندگی میں اس سے بہت دور تھے
یہ ایک خیالی اور مثالی نوعیت کا تصور تھا۔ وہ کمزور دل کے انسان تھے
جیسا کہ علی سردار جعفری نے خیال ظاہر کیا ہے

"انقلابی صفوں میں آگے آگے رہنے کی خواہش کے باوجود

دل کی نزاکت کا یہ عالم تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات میں بمبئی میں
ایک آدمی کو قتل ہوتے دیکھ لیا تو تین دن کھانا نہیں کھا سکا۔"[1]

اس نازک دل اور نحیف الجثہ شاعر کو "مرد انقلابی" کی حیثیت
سے مشاعروں میں ہزاروں افراد کے مجمع کا سامنا کرنے اور ان پر چھا جانے کے لئے
کسی سہارے کی یقیناً ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور شراب سب سے مضبوط سہارا
ثابت ہوئی۔ اس نتیجے پر پہونچنے کا خاص سبب یہ ہے کہ مجاز شراب کے
سہارے کے بغیر مشاعرہ گاہوں میں صرف اس صورت میں قدم رکھتے تھے جب
ایسی ہی کوئی مجبوری ہو۔ اور جب کبھی کبھی وہ شراب کے سہارے کے بغیر مشاعرہ
پڑھتے تھے مشاعروں کی اصطلاح میں "ہجوم کو چادر کی طرح الٹ دینے" والی
کامیابی نہیں حاصل کر پاتے تھے۔ انھیں اس سہارے کی ضرورت سنہ ۳۹ء
سنہ ء میں بھی تھی جب وہ صحیح معنوں میں جوان تھے ان میں خاصا دم خم
تھا اور شراب کے سہارے کے بغیر بھی اچھے ترنم کے ساتھ کلام سنا سکتے
تھے۔ اس کا اندازہ مجتبیٰ حسین کے مضمون "مغنی آتش نفس"[2] میں بیان
کئے ہوئے ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں مسلم بورڈنگ ہاؤس
کے سالانہ مشاعرہ میں مجاز "آوارہ" سنا رہے تھے جب وہ اس مصرعے
پر پہونچے — "زخم سینہ کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں" تو صفیہ مرحوم

---

[1] لکھنؤ کی پانچ راتیں

[2] مجاز ایک آہنگ

نے بے تابانہ داد دیتے ہوئے ان کی پیشانی چوم لی۔ حالاں کہ مجاز نشے میں دھت تھے اور ان کے منھ سے شراب کی ایسی تیز بو آرہی تھی کہ حضرت صفی کا ان کے قریب بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ بعد کے برسوں میں جب وہ جسمانی اعتبار سے نڈھال اور کھوکھلے ہو چکے تھے مشاعرہ گاہوں میں عزم اور اعتماد کے ساتھ قدم رکھنے کے لئے انھیں ہمیشہ شراب کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ریڈیو کے مشاعروں کو چھوڑ کر جہاں وقت کی پابندی اور خود کو لئے دیئے رہنا ضروری ہوتا تھا باقی زیادہ تر بڑے اور اہم مشاعروں میں وہ دو ایک دوسرے شاعروں کے ساتھ عموماً دیر سے پہونچتے جب کہ مشاعرہ شروع ہو چکا ہوتا۔ ساری نگاہیں ان کی طرف اٹھ جاتیں۔ لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال، شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے بے تابی کے ساتھ ہاتھ اور بازو ہلاتے ہوئے۔ "آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے" کی تصویر بنے ہوئے ان کے لئے ڈائس پر سکون سے بیٹھنا سخت دشوار ہوتا۔ خود کو سنبھالنے، ضبط کرتے، شاعر دوستوں سے الٹے سیدھے جملوں میں باتیں کرتے یا پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر کبھی شاعروں اور کبھی سامعین سے اشاروں اشاروں میں معذرت کرتے آخر ان کا نام پکارا جاتا اور اچانک ان میں بلا کی طاقت آجاتی۔ سنبھلتے ہوئے اٹھتے اور مائیکروفون کے سامنے آکر اپنی مخصوص پرسوز آواز میں کلام سنانے لگتے۔

مشاعرے میں کامیابی کا ہمیشہ انھیں بے حد خیال رہتا تھا اور سوائے ان مواقع کے جب وہ اپنے قابو میں نہ ہوتے سامعین کی خواہشات اور فرمائش

کا بہت احترام کرتے اور مشاعرہ لوٹ کر مائیکروفون کے سامنے سے ہٹتے ۔ پڑھ
چکنے کے بعد انھیں سکون سا مل جاتا ۔ جیسے کوئی ذہنی اور قلبی ہیجان ہوتا تھا جو
مائیکروفون کے سامنے سے ہٹ آنے کے بعد خود بخود ختم ہو جاتا تھا ۔ مشاعروں
میں مجاز کو جتنی اور جیسی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اتنی اور ویسی کامیابیاں
جگر صاحب کے سوا شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہوں ۔ اپنی شخصیت کا جیسا
تاثر چھوڑ کر وہ مائک کے سامنے سے ہٹتے تھے ویسا بھرپور تاثر ان کے ہم عصروں
میں شاید ہی کوئی چھوڑتا ہو ۔ اسی لئے جب تک اس نسل کے لوگ زندہ ہیں
جنھوں نے ملک کے مختلف شہروں میں اس لمبے لمبے بالوں اکہرے بدن کی چھوٹی ہوئی
شیروانی اور ڈھیلے پاجامے والے شاعر کو "آوارہ" اور "اعتراف" جیسی نظمیں
پڑھتے دیکھا ہے اس وقت تک عوامی سطح پر مجاز کے کلام کی مقبولیت کم ہونے
کا امکان نہیں اور اسی لئے یہ کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ ان کی شاعری
کی مقبولیت میں ان کی شخصیت کا بھی بہت ہاتھ تھا ۔ یہ شخصیت ایسی عجیب و غریب
مگر ساتھ ہی اتنی زیادہ پرکشش تھی کہ اسی کی بدولت مجاز حسن عسکری کے
الفاظ میں "اردو کی تاریخ میں ہمیشہ ایک افسانہ بنے رہیں گے" [1]

---

[1] شاعر شہر نگاراں (مجاز سے متعلق مضامین کا انتخاب)

دوسرا حصّہ

ذہنی اور فکری ارتقا

مجازؔ کی شاعری کا آغاز ایک ایسے زمانے میں ہوا جب ہندستان
نئی منزلوں کے خوابوں کو کلیجے سے لگائے ہوئے نئے راستوں کی تلاش میں سرگرداں
تھا۔ اور نئے حقائق اپنی تمام پیچیدگیوں اور امکانات کے ساتھ ابھر کر
سامنے آ رہے تھے۔ ملک کی عام زندگی تیزی کے ساتھ ایک خاموش انقلاب
سے ہمکنار ہو رہی تھی۔ کچھ پرانی قدروں کا دامن ہمیشہ کے لئے ہاتھوں سے
چھوٹ رہا تھا، کچھ اپنی شکلیں بدل کر پہلے سے زیادہ محبوب ہو گئی تھیں اور
کچھ بالکل نئی قدریں جنم لے رہی تھیں۔ یہ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی ہر
لحاظ سے ایک زبردست بیداری کا زمانہ تھا جس کے زیر اثر ہر شعبۂ حیات کے
قافلے کو نئی قیادت اور نئے ولولے مل رہے تھے۔

ملک کی بعض دوسری زبانوں کے ادب کی طرح اردو ادب بھی تیزی
کے ساتھ بدلتے ہوئے ان حالات کا آئینہ دار تھا۔ ایک سرے پر اقبالؔ کی عظیم
شخصیت فکر و فلسفہ کی ان رفعتوں کو چھو رہی تھی۔ جہاں تک اس سے قبل

اردو کا کوئی شاعر نہیں پہونچا تھا۔ دوسرے سرے پر پریم چند ننگے بھوکے ہندستان کی ان بستیوں کا احساس دلا رہے تھے جو ہمارے درمیان تھیں لیکن ان سے پہلے کسی نے کبھی ان کی طرف توجہ ہی نہیں کی تھی ان دو سروں کے درمیان نیاز، اقبال، جوش، حفیظ، اختر شیرانی، اصغر، حسرت، فانی، یگانہ، جگر، قاضی عبدالغفار، ساغر نظامی اور متعدد دوسرے ادیب شاعر تھے ان میں کوئی حسن و عشق کے نغمے بالکل نئے انداز سے گا رہا تھا اور کوئی آزادی اور انقلاب کا علمبردار تھا۔ کوئی نظم کو نئی وسعتیں عطا کر رہا تھا اور کوئی غزل کو نیا لب و لہجہ دے رہا تھا

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا ماحول بھی جو مجاز کے ذہنی اور فکری ارتقا کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے ملک کی تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی اور قومی بیداری کے رجحانات کا آئینہ دار تھا۔ مجاز کے لئے یوں تو آگرہ کے قیام کا زمانہ بھی اہم ثابت ہوا لیکن آگرہ کے ادبی ماحول سے ان کے ذہن نے جو اثرات قبول کئے وہ زیادہ تر فنی اور تکنیکی نوعیت کے تھے۔ یہاں کی ابتدائی مشغولوں کے بعد جب مجاز علی گڑھ پہونچے تو وہاں یونیورسٹی کی ادبی اور تہذیبی زندگی اور عام ماحول آگرہ کے ماحول سے بہت ہی مختلف تھا۔ انھیں ایک طرف تو وہ رنگین ماحول ملا جس میں لڑکیاں ان سے ملے بغیر ان پر جان چھڑکتی تھیں ان سے شادی کرنے کے لئے لاٹری ڈالی جاتی تھی اور کنواریاں اپنے آئندہ بیٹوں کے نام ان کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں دوسری طرف کچھ اساتذہ اور طلبا کا وہ حلقہ تھا جو سیاست اور ادب میں نئی قدروں کا علمبردار تھا اور جس میں کمیونسٹ پارٹی کے مستقبل کے بعض لیڈر اور ترقی پسند ادب

کی تحریک کی بنیادیں رکھنے والے باغی جوان شامل تھے۔ ایک ماحول پر عصمت چغتائی نے نئے ادب کے معمار نامی کے سلسلے میں مجاز پر اپنے کتابچے میں روشنی ڈالی ہے دوسرے سے کے متعلق آل احمد سرور نے یوں اظہار خیال کیا ہے۔

"اسی زمانے میں علی گڑھ میں نئے خیالات کی رو شروع ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف یورپ سے واپس آگئے تھے۔ اختر رائے پوری بی اے کرنے کے لئے آفتاب ہوسٹل میں مقیم تھے۔ وہیں سبط حسن بھی تھے۔ اختر رائے پوری نے اپنا مضمون "ادب اور زندگی" اسی زمانے میں لکھا تھا جب وہ رشید صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ سبط حسن کے بعض ترجمے اور حیات اللہ انصاری کی کہانیاں بھی ہیں نے علی گڑھ میگزین میں شائع کی تھیں۔ سجاد ظہیر آکسفورڈ میں ایک طویل عرصے تک قیام کرنے کے بعد علی گڑھ بھی آئے تھے۔ "انگارے" شائع ہوتے ہی ضبط ہو چکی تھی۔ میں نے میگزین میں اس پر سخت تنقید کی۔ خواجہ منظور حسین صاحب نگراں تھے وہ انگارے کو بعض ادبی تجربات کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ میرا مضمون انھیں پسند نہ آیا مگر انھوں نے اس پر احتساب نہ کیا۔ یہ باتیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ نئے خیالات کی اس رو کا مجاز پر بھی اثر ہوا اور "نمائش اور صبح بہار" کا لکھنے والا انقلاب کا نقیب بن گیا۔"[1]

---

[1] علی گڑھ میگزین مجاز نمبر

علی گڑھ کے اس ماحول نے جس میں حسن و نغمہ، ساز و جام اور تیغ و سناں کی بڑی خوبصورت سی آمیزش پائی جاتی تھی مجاز کے شعری مزاج ذہنی رویہ اور فکری پرواز کی راہیں متعین کیں۔ ایک طرف تو وضعداری، شرافت مروت، خوش مذاقی اور انسانیت دوستی کی ان قدروں کی تکمیل میں علی گڑھ کے ضبط و نظم اور آزاد خیالی کی فضا نے مدد کی جو انھیں ایک روشن خیال خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانے سے ملیں تھیں دوسری طرف آغاز شباب کی حسن پرستی کو جس کی طرف ان کی بہن بیگم حمیدہ سالم نے اشارے کئے ہیں اور جس کی ہلکی سی جھلک آگرہ کے زمانہ قیام سے متعلق میکش اکبرآبادی کے تاثرات میں ملتی ہے۔ علی گڑھ کی فضاؤں اور خواتین میں ان کی زبردست مقبولیت سے رومانی طرز فکر کا ادب دھارنے میں مدد ملی تیسری طرف ڈاکٹر اشرف۔ اختر رائے پوری۔ آل احمد سرور۔ حیات اللہ انصاری۔ جاں نثار اختر۔ سبط حسن، علی سردار جعفری۔ جذبی اور ایسے دوسرے نوجوانوں سے قربت اور دوستی نے جو مارکسزم سے متاثر تھے اور اپنی تحریروں سے ترقی پسند ادب کے ابتدائی نقوش اجاگر کر رہے تھے مجاز کو اشتراکیت، انقلاب اور ترقی پسندی کے تصورات سے واقف کرایا۔ اور یہ سب عناصر ان کی ذہنی اور فکری دنیا کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئے۔ عام انسانیت دوستی کی اقدار اور حسن پرستی کے رجحان نے رومانی مزاج اور افتاد طبیعت عطا کی اور اشتراکی اثرات نے انھیں مرد انقلابی کا کبھی نہ ہار ماننے والا عزم حوصلہ اور بانکپن بخشا۔ لیکن مجاز نے رومان اور انقلاب کے تصورات کو

زندگی کی الگ الگ منزلوں پر نہیں بلکہ بیک وقت قبول کیا دونوں تصورات
کے خوبصورت امتزاج نے ان کی شاعرانہ شخصیت کی تشکیل کی اور ان کے
فکری نظام) کی عمارت کے لئے ساز و جام اور شمشیر ستون کی حیثیت اختیار کر گئے
یہ شخصیت شاعری کے میدان میں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی
تو فیض احمد فیض نے "آہنگ" کے دیباچہ میں رائے ظاہر کی کہ مجاز کی شاعری
ساز و جام اور شمشیر تینوں اجزا سے مرکب ہے اور اس بات پر زور دیا کہ
مجاز کے یہاں بیشتر شعرا کے برعکس ان عناصر میں فرضی تضاد کی دیواریں
نہیں حائل بلکہ شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز دونوں ایک دوسرے
میں گھل مل گئے ہیں۔

سخت اور بے لوچ رویہ اختیار کر کے تجزیہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوگا
کہ مجاز کے ذہنی اور فکری ارتقا کا سلسلہ علی گڑھ کے زمانہ قیام میں جہاں تک
پہونچا تھا وہیں رک کر رہ گیا اور سیاسی اور ادبی طور پر انھوں نے علی گڑھ
میں جن تصورات اور نظریات کو اپنایا تھا ان میں آخر وقت تک کوئی تبدیلی
نہیں ہوئی اس سلسلے میں فیض کی یہ رائے بھی جو ابتدائی دور سے متعلق تھی ان کی سا
شاعری کے سلسلے میں صحیح معلوم ہوگی:

"ابھی تک شمشیر کم ہے اور ساز و جام زیادہ، اس کی
وجہ یہ ہے کہ شمشیر زنی کے لئے ایک خاص دماغی زہد کی ضرورت
ہوتی ہے لیکن مجاز کی طبیعت میں زہد کم ہے اور لذتیت زیادہ۔
شمشیر زنی کو میں انقلابی شاعری کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں

اور دماغی زہد سے میری مراد ہے ایک مخصوص انقلابی مقصد کے نشر و اظہار میں کلی ذہنی اور جذباتی یکسوئی، تمام غیر متعلق جذباتی ترغیبات سے پرہیز۔ یہ کٹھن اور محنت طلب عمل ہے۔ مجازؔ ہم سب کی طرح لاابالی انسان ہیں۔ چنانچہ اکثر جب بھی ذوقِ پنہاں کی کامرانی کا موقع ملے باز نہیں رہ سکتے۔" ؎

اس میں شک نہیں کہ اسی لاابالی پن اور سہل انگاری کی بنا پر ہی کی فیض نے بڑے محبت بھرے لہجے میں شکایت کی تھی۔ مجازؔ کا ذہنی اور ری ارتقا کسی بڑے شاعر کے شایانِ شان طور پر نہیں ہو سکا۔ جو کچھ پڑھا یا سیکھا تھا وہ علی گڑھ تک پڑھ اور سیکھ چکے تھے۔ بعد میں کم عمری کی شہرت اور مقبولیت اور ان کے مخصوص طرزِ زندگی نے مطالعہ کی طرف سے نہیں قطعی یا بالکل بے نیاز رکھا۔ ان رسالوں کے سوا جو کبھی کبھی ان کے پاس جاتے تھے کبھی کوئی کتاب یا رسالہ ان کے پاس نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اس واسطے میں متعدد ناقدین کی یہ رائے بھی یقیناً وزن رکھتی ہے کہ مجازؔ نے اپنے مطالعہ کو وسعت دینے کی کوشش نہیں کی اور اس کا نتیجہ آخر کار فکری جمود کی شکل میں ظاہر ہوا۔

لیکن اس قسم کے نتائج اخذ کرنا مجازؔ کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ مجازؔ دراصل کتابوں کے نہیں زندگی کے شاعر تھے کتابوں سے ان کا رشتہ

؎ دیباچہ آہنگ

اتنا گہرا اور پائیدار کبھی نہیں رہا جتنا زندگی سے تھا۔ اور یہ ایک لحاظ
سے اچھا ہی ہوا۔ علی گڑھ میں وہ اشتراکی خیالات سے متاثر ہوئے تھے
اور آخر دم تک اشتراکیت کے حامی رہے۔ لیکن یہ حمایت اور وابستگی کتا
نہیں جذباتی تھی۔ وسیع مطالعہ کے نتیجہ میں وہ اشتراکیت سے منحرف ہو جاتے
تب تو خیر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی ذہنی اور فکری وابستگی کس قسم کے خیالات
اور نظریات سے ہوتی اور ان کی شاعری پر اس کے کیا اثرات پڑتے لیکن اشتراکیت
سے اپنی وابستگی کے ساتھ ہی وہ متعلقہ سیاست اور ادب کا زیادہ مطالعہ کر کے
"انقلابی شاعر" بننے کے چکر میں مبتلا ہوتے تو اسبابات کا کھلا تو ہی امکان تھا
کہ وہ دوسرے ترقی پسند یا کمیونسٹ شاعروں کی طرح طویل طویل "منظوم تقریریں"
لکھنے لگتے اور آج کسی کو اتنی محبت کے ساتھ مجازؔ کا نام لینے کی ضرورت بھی
نہ محسوس ہوتی۔

دوسری طرف جہاں تک اپنے زمانے کی زندگی کا تعلق تھا اس سے
جیسی اور جتنی قربت مجازؔ کو حاصل تھی ویسی اور اتنی قربت ان کے ہم عصروں
میں سے کسی کو نہیں حاصل ہوئی۔ اونچے طبقے کی زندگی اور بزم صوفی گردیں
برپائی لیے اگے ماحول سے لے کر تنگ و تاریک گلیوں کے قحبہ خانوں (ان کا
مجازؔ کی شاعری میں لفظ "شبستان" کی پردے بڑے رومانی انداز سے ہوا ہے
تک، ملک کے بڑے بڑے شہروں کے باروں اور شاندار بے خانوں سے لے کر غلیظ
اور نیم تاریک تاڑی خانوں تک، اعلیٰ سرکاری افسروں کے گرد دفتر اور عزت
شہر یاری سے لے کر کیفی چیائیں یعنے سڑکوں پر بے مقصد منڈلاتے ہوئے بے

نوجوانوں کے احساسِ شکست اور جھنجھلاہٹ تک ، کافی ہاؤس اور ڈرائنگ روموں کے ادبی اور سیاسی مباحثوں سے لے کر علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے محنت کشوں کے بڑے بڑے جلوسوں تک زندگی کو مجاز نے ان گنت روپ میں دیکھا ، برتا اور تاثر قبول کیا ۔ عام سیاسی بیداری کے ساتھ ہی مجاز کی شاعری کے ابتدائی زمانہ میں ملک کی تہذیبی زندگی میں جس نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا ۔ وہ بھی ان کی نظروں میں تھا ۔ یہ زندگی کچھ اس قسم کی تھی ۔

"یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ اور پٹنہ اور الہ آباد اور لکھنؤ اور علی گڑھ کی یونیورسٹیاں ملک کے علمی ، ادبی اور کلچرل زندگی کے مرکز بنی ہوئی تھیں جب قاضی نذرالاسلام اور ہریندر ناتھ چٹوپادھیا اور کرشن چندر اور امرتا شیرگل کے ناموں میں عجیب طرح کی مقناطیسیت معلوم ہوتی تھی ۔ جب ملک میں ہر روز نت نئے چراغ جلتے چلے جا رہے تھے ۔ اودے شنکر نے رقص کی تجدید و ترویج کے لئے المورے میں کلچرل سنٹر قائم کیا تھا ۔ گروپ تھیٹر موومنٹ شروع کیا گیا تھا ۔ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد نئی نئی کتابیں شائع کر رہی تھی ، عثمانیہ یونیورسٹی میں ، دار المصنفین اعظم گڑھ میں ادب پر ٹھوس کام کیا جا رہا تھا ۔ الہ آباد اور لکھنؤ یونیورسٹیوں کے طالب علم اپنے گروؤں کے قدموں میں بیٹھ کر علم حاصل کرنا اپنی زندگی کا واحد مقصد گردانتے تھے ۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور آل انڈیا ویمنز کانفرنس کے پلیٹ

فارم سے دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔"[1]

مجاز اپنے تمام لاابالی پن اور بوہیمین ازم کے باوجود بلکہ شاید اسی وجہ سے ان تمام حالات اور تغیر پذیر زندگی سے براہ راست اثر قبول کرتے رہے اس لئے وہ فکری جمود کا شکار نہیں ہوئے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ذہنی اور فکری ارتقا کا عمل ان کی شاعری کے آخری دور تک جاری رہا جسے ان کے انتقال سے چند برس قبل ہی ختم سمجھنا چاہیئے کیوں کہ ۱۹۵۰ء کے بعد کوئی بہت اہم شعری تخلیق ان کے قلم سے نہیں نکلی۔

شاعری کو سامنے رکھ کر مجاز کے فکری ارتقا کے مراحل کی نشان دہی کرتے وقت اس خیال سے کچھ دشواری محسوس ہوتی ہے کہ "آہنگ" کی ترتیب کے موقع پر کچھ نظمیں غزلیں آگے پیچھے کردی گئی تھیں اور کچھ تخلیقات شامل نہیں کی گئیں[2] لیکن مجاز کے یہاں مختلف خیالات کے رد و قبول کی نہ کوئی کشمکش ملتی ہے اور نہ کوئی ڈرامائی موڑ آتے ہیں اس لئے چند نظموں غزلوں کے آگے پیچھے کئے جانے سے ان کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے کے سلسلے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فکری ارتقا بھی فنی اور ہیئتی ارتقا کی طرح اپنے اندر ایک خاص قسم کا تسلسل رکھتا ہے اور اس لحاظ سے ان کی ابتدائی اہم نظم "انقلاب" سے لے کر ان کی آخری اہم نظم

---

[1] "اندھیری رات کا مسافر" از قرۃ العین حیدر (مجاز ایک آہنگ)

[2] ادب اور تہذیب

"فکر" تک ذہنی سفر کی منزلیں متعین کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

"انقلاب" میں مجاز نے ملک کی آزادی اور "سرخ آندھی" کی آمد کا پیغام دیا ہے۔ اور انقلاب کے سلسلے میں چار مرحلوں پر زور دیا۔ (۱) مسلح جدوجہد شروع ہونے کے آثار (۲) سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ (۳) مزدوروں کا جوشِ انتقام اور انقلاب کے لئے ہونے والی مسلح جدوجہد کے دوران خون خرابہ اور (۴) انقلاب اور آزادی۔ اس نظم کے متعلق سردار جعفری کے مندرجہ ذیل بیان سے اس کا پس منظر سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

"میں نے مجاز کی پہلی نظم جو اس کی زبان سے سنی "انقلاب" تھی یہ غالباً ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا اور ہندوستان کے نوجوانوں میں ایک عام بے چینی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ فضا میں سوشلزم کے نعرے بلند ہو رہے تھے جو کانگریس کے ایوان تک پہونچ گئے اور ۱۹۳۶ء میں کانگریس کے لکھنؤ اجلاس کے صدارتی خطبے میں پنڈت نہرو کی زبان سے ادا ہوئے"۔ [۱]

یہاں اس سے بحث نہیں کہ اس نظم میں انقلاب کا جو تصور پیش ہوا ہے وہ رومانی ہے یا حقیقت پسندانہ۔ اس نظم کی اہمیت اس جائزہ کے سلسلے میں صرف اتنی ہے کہ ابتدائی غزلوں اور دو ایک رومانی نظموں کے بعد یہ پہلی نظم ہے جو علی گڑھ میں باغی جوانوں کے حلقہ کے زیر اثر مجاز کے

---

[۱] مجاز پر مضمون "کفن بردوش" (شاعر شہر نگاراں)

اپنائے ہوئے خیالات کی نشان دہی کرتی ہے۔ انھوں نے پہلی بار ملک کی آزادی
سرمایہ داری کے خاتمہ اور سوشلزم کے قیام کو اپنا نصب العین بنایا اور اسی نصب العین
کی باغیانہ جوش و خروش کے ساتھ بھرپور انداز میں ترجمانی کی۔ اس قسم کے خواب
اس زمانے میں ملک کے زیادہ تر تعلیم یافتہ نوجوانوں کو عزیز تھے مجاز نے ان
خوابوں کو نظم کے قالب میں ڈھال دیا۔ اس قسم کے خوابوں کا نشہ ان کی تمام ابتدائی
شاعری پر چھایا ہوا ہے اور ان کی ترجمانی "شوق گریزاں" "رات اور ریل"۔
"تعارف" "خانہ بدوش" "نذر علی گڑھ" اور "مسافر" وغیرہ میں بھی بھرپور
انداز میں ہوئی ہے۔

کسی فنکار ادیب یا شاعر کے ذہنی اور فکری ارتقا کی منزلیں قطعیت
کے ساتھ متعین کرنا اور یہ فیصلہ صادر کرنا ممکن نہیں ہوتا کہ کسی خاص تخلیق سے
جس رجحان کا آغاز ہوتا ہے وہ کس مدت سے کس مدت تک جاری رہا۔
کیونکہ ارتقا کا عمل کسی میکانکی انداز میں ظہور پذیر نہیں ہوتا اور کسی خاص فکری
رجحان کے آغاز کے بعد کی مدت میں ایسی تخلیقات بھی مل سکتی ہیں جو اس رجحان
سے مطابقت نہ رکھتی ہوں لیکن مطالعہ و تجزیہ کے کام کو آسان بنانے کے لئے
بعض ادوار مقرر کر لئے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ "اندھیری رات
کا مسافر" سے ذہنی اور فکری ارتقا کے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس
دور کی نظموں میں "آوارہ" "اندھیری رات کا مسافر" اور "خواب سحر" خاص
طور سے اہمیت رکھتی ہیں۔ "طفلی کے خواب" "نوجوان سے" "نوجوان خاتون
سے" "پردہ اور عصمت" اور "سرمایہ داری" بھی اس دور کی ایسی نظمیں ہیں

جو ذہنی ارتقا کے سلسلے میں کسی نہ کسی حیثیت سے قابل ذکر ہیں۔ مجازؔ کے تصورات اب بھی باغی نوجوانوں کے ہیں۔ تندی اور تیزی بھی وہی ہے اور عزم اور بانکپن بھی وہی لیکن اب خوابوں میں حقیقت کے عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں۔ رومانیت، انقلابی رومانیت سے قریب تر ہو گئی ہے اور "انقلاب" کا شاعر اب زیادہ باشعور، بالغ نظر اور حقیقت پسند ہو گیا ہے۔ "انقلاب" میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں انقلاب کی آمد کو نہ صرف ناگزیر بلکہ بہت آسان بھی بتایا گیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ انقلاب اب آنے ہی کو ہے۔ حالاں کہ بعد کے سیاسی حالات اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس قسم کے امکانات بہت ہی دور تھے۔ اس تصور پر "اندھیری رات کا مسافر" میں پایا جانے والا تصور اس لحاظ سے بلاشبہ اضافہ ہے کہ یہاں ان مشکلات کا بڑے اچھے انداز میں تذکرہ ملتا ہے جو انقلاب لانے کی راہ میں حائل ہوتی ہیں اس کے ساتھ ہی ان مشکلات کے باوجود جدوجہد جاری رکھنے کا یہ عزم

مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

رومانی کم اور حقیقت پسندانہ زیادہ ہے۔

"آوارہ" جو مجازؔ ہی کی نہیں اردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے خوابوں سے حقائق کی طرف مجازؔ کے ذہنی سفر کے سلسلے میں "اندھیری رات کا مسافر" سے بھی زیادہ اہم ہے۔ "اندھیری رات کا مسافر" میں مشکلات کا عمومی انداز میں تذکرہ ہے اور ان مشکلات کے باوجود آگے بڑھتے جانے کے عزم کا اظہار۔ "آوارہ" کا بنیادی خیال بھی اس سے ملتا جلتا ہے لیکن اس نظم میں

اپنے عہد کے سماجی حالات کے پس منظر میں اس خیال کو نسبتاً زیادہ کامیابی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ یہاں اجوا کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفان ہے (اندھیری رات کا مسافر) کی وضاحت بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں کی گئی ہے۔ اس نظم میں "انقلاب" اور "اندھیری رات کا مسافر" کا مرد انقلابی اپنی اصلی شکل میں سامنے آتا ہے۔ جس کو بے روزگاری کا سامنا ہے۔ محبت کی ناکامی کا سامنا ہے۔ مفلسی کا سامنا ہے جس کی آرزوؤں اور امنگوں کا خون ہوتا ہے اور جو صنعتی عہد کے بڑے شہروں کی شاندار اور جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ پھرنے کے لئے مجبور ہے۔ ان تمام ناخوش گوار حالات کے خلاف اس کے دل میں نہایت ہی شدید قسم کا ردعمل ہوتا ہے اور وہ اس نظام کا تختہ الٹ دینے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے جس نے اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں

تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں

"مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں" اور "چنگیز کے خنجر توڑ ڈالنے کے ارمان" میں زیادہ فرق نہیں لیکن یہاں مجاز اپنی تمام پچھلی نظموں کی بہ نسبت کہیں زیادہ حقیقت پسندانہ طریقے پر اس خیال کو، ان ٹفرادی تجربہ اور سماجی حالات کے پس منظر میں پیش کرتے ہیں اور

ایک لمحہ کے لئے مجازؔ کے حالات زندگی کو بھول کر صرف اس نظم کو ذہن میں رکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس پورے عہد کی ترجمانی کردی ہے

"خواب سحر" مجازؔ کی شاعری کے اس زریں دور کی ایک ایسی نظم ہے جو فکری ارتقا کے ایک اور پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ یہاں وہ کھل کر اشتراکیت کو انسان کی نجات کی منزل قرار دیتے ہیں۔ تاریخ انسانی کا ایک خاص انداز سے تجزیہ کرتے ہوئے وہ ان اشعار پر نظم ختم کرتے ہیں :

ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

یہ نظم انقلاب روس کی ایک سالگرہ کے موقع پر لکھی گئی تھی[1] اور اس پس منظر میں یہ سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ "خواب سحر" سے ان کی مراد کیا ہے۔

مجازؔ کے ذہنی اور فکری ارتقا کی تیسری اور آخری منزل ان کی خوبصورت نظم "فکر" ہے۔ جہاں آگ اور خون پر زور دینے والا شاعر "جنون تعمیر" کی باتیں کرتا ہے۔ جہاں مٹ جانے اور برباد ہو کر رہ جانے کے باوجود دل میں زیاں کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔ جہاں

---

[1] سردار جعفری "کھیتی بردوش" میں (شاعر سنہ نگار ان)

زندگی کی ساری جد و جہد کی تھکن ملتی ہے، غم ملتے ہیں آرزوؤں کا خون ملتا ہے لیکن

دل مضطر ابھی آما جگہ یاس نہیں

کا بھی یقین ہے اور آخر میں اس تقاضائے حیات کا شدید احساس بھی کہ

خون دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خون دل نذر چمن بندی دوراں کر دے

اس نظم کے بعد کوئی دوسری تخلیق فکری ارتقا کے سلسلے میں قابل ذکر نہیں۔ "انقلاب" سے لے کر "فکر" تک سترہ اٹھارہ برسوں کی شاعری میں تذکرہ بالا نظموں کے ذریعے ان کے فکری ارتقا کا تجزیہ ایک خاص تسلسل کی بنا پر کیا گیا ہے۔ اس درمیان میں خاصا بڑا حصہ ان کی عشقیہ شاعری کا بھی ہے اسے اس تجزیہ میں اس لئے نہیں شامل کیا گیا کہ ان کا تصور عشق بھی ان کے اس تصور حیات کا ہی ایک جزو ہے جس کی تشکیل علی گڑھ یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانہ میں ہوئی تھی جسے وہ بعد کے تجربات اور مشاہدات سے وسعت دیتے رہے اور جس سے مرتے دم تک ذہنی طور پر خود کو وابستہ رکھا۔ مجاز اپنے انھیں تصورات کی بدولت عشق کی ناکامی کے بعد سر اٹھا کر یہ کہنے کی جرأت کر سکے۔

یہ جا کر کوئی بزم خوباں میں کہہ دو
کہ اب درخور بزم خوباں نہیں میں
مبارک تمھیں قصر و ایوان تمھارے

وہ دلدادۂ قصر و ایواں نہیں ہیں
جوانی بھی سرکش، محبت بھی سرکش
وہ زندانیٔ زلفِ پیچاں نہیں ہیں

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی اہم نظم سے لے کر آخری اہم نظم تک مجاز ذہنی اور فکری طور پر جمود کا شکار نہیں ہوئے۔ یہ ضرور ہے کہ آخری کچھ برسوں میں خاص طور سے سنہ ۱۹۵۰ء کی نظم "فکر" اور "جنون شوق اب بھی کم نہیں ہے"۔ والی غزل کے بعد انھوں نے نہ لکھنے کے برابر لکھا لیکن دراصل اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ سنہ ۵۲ء کے جنون کے حملے اور بعد کے انتہائی افسوس ناک حالات میں زندگی نے انھیں بالکل بے جان کر کے ان کے ہاتھوں سے ان کا ساز چھین لیا تھا۔ اب نہ باغی زندہ تھا نہ شاعر، شعر کون کہتا؟

فنی و ہیئتی شعور

مجاز نظم کے شاعر ہیں اور جن دنوں ان کی تخلیقی سرگرمیاں شباب پر تھیں جدید نظم اپنے نہایت ہی ہنگامی مگر زرین دور سے گزر رہی تھی۔ ترقی پسند ادب کی ملک گیر تحریک اور حلقہ ارباب ذوق لاہور کی نسبتاً محدود لیکن بہت ہی موثر تحریک نے جدید نظم کو بے پناہ وسعت عطا کردی تھی۔ اس زمانے میں نظم آزاد اور نیم آزاد نیم پابند نظموں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی تکنیک کے میدان میں اتنے زیادہ تجربات کئے گئے جتنے اس سے قبل اردو شاعری کے کسی بھی ایک دور میں نہیں کئے گئے تھے اور موضوعات کے تنوع نے انقلاب زندہ باد کے نعروں سے لے کر پے چیدہ جنسی اور نفسیاتی الجھنوں تک کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس میں شک نہیں کہ ادبی تجربات کے ہر دور کی طرح جدید اور آزاد نظم کے اس تجرباتی اور عبوری دور میں بھی بے راہ روی کے بے شمار نمونے "ہمایوں"، "ادب لطیف" اور "ساقی" جیسے معیاری ادبی رسائل میں پیش ہوئے۔ ترقی پسندوں کے ایک حلقے نے سیاسی انتہا پسندی

کے زیر اثر موضوع کو سب کچھ قرار دیتے ہوئے فارم اور ہیئت کو سرے سے نظر انداز کیا (لیکن اس حلقہ کے شاعروں نے بھی آزاد نظم کو مؤخر حربہ کے طور پر اپنایا) دوسری طرف حلقہ ارباب ذوق نے ہیئت پرستوں کا ایک گروہ تیار کر دیا۔ ایک کے اثر سے شاعری سیاست بلکہ منظوم تقریر بنا کر رہ گئی اور دوسرے کے اثر سے میراجی اور ان کے نسبتاً کم عمر پیرووں مثلاً قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی اور انجم رومانی وغیرہ نے کچھ ایسی نظمیں بھی لکھیں جو اس گروہ کی طرف سے کی جانے والی تمام تشریحات کے باوجود اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو مہمل ہی معلوم ہوئیں۔ اس گروہ کے بعض شعرا مثلاً مخمور جالندھری نے اسی زمانے کے افسانوں کی طرح اپنی کچھ نظموں میں عریاں نگاری کو بھی جائز تصور کیا۔

ان خامیوں یا کوتاہیوں کے باوجود ن۔ م۔ راشد، فیض احمد فیض، میراجی۔ اختر الایمان، مخدوم محی الدین، سردار جعفری اور سلام مچھلی شہری وغیرہ نے آزاد اور نیم پابند نیم آزاد نظموں کے بڑے کامیاب تجربے کئے خالص ہیئتی اور فنی نقطہ نظر سے اردو شاعری کے لئے یہ تجربات بڑی اہمیت رکھتے تھے اور انھیں تجربات کے ذریعے اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی کے شروع کئے ہوئے فنی تجربات تکمیل کے مراحل کو پہونچے اردو نظم کو صحیح معنوں میں پہلی بار غزل کے اثرات سے نجات ملی۔ نظم میں مصرع کے بجائے مصرعے کو اہمیت حاصل ہوئی، قافیہ کا تصور بدلا بھی اور کہیں کہیں ختم بھی ہوا اور خیال

کی ترجمانی قافیوں کی محتاج ہونے کے بجائے یکساں ارکان یا کم زیادہ ارکان والے مصرعوں کے ذریعے ہونے لگی۔

مجازؔ ان تحریکوں خاص طور سے ترقی پسند تحریک سے شروع ہی سے وابستہ تھے اس کے ساتھ ہی آزاد نظم کے اہم ترین تجربات کرنے والے دو شاعروں ن۔م۔ راشدؔ اور میراجی سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات قائم تھے اور دہلی میں راشدؔ کی ریڈیو کی ملازمت کے دوران ان کی راشدؔ سے خاص دوستی تھی لیکن انھوں نے ان تمام تجربات سے اپنا دامن اس حد تک بچایا کہ اسلوب احمد انصاری کو اس خیال کا اظہار کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوئی۔

"ٹکنیک کے معاملے میں وہ پرانی روش سے سرمو انحراف نہیں کرتے اور انھوں نے جدید وضع کے تجربوں سے ہمیں روشناس نہیں کرایا"۔ [۱]

مجازؔ کے یہاں کچھ نظمیں ایسی ملتی ہیں جن میں نظم کی پرانی روش کے بموجب ہر شعر علاحدہ علاحدہ ہم قافیہ ہے ایسی نظموں میں نرس کی چارہ گری (سنہ ۳۶ء) ننھی پجارن (سنہ ۳۶ء) نذر علی گڑھ (سنہ ۳۶ء) دلی سے واپسی (سنہ ۳۶ء) بربط شکستہ (سنہ ۳۷ء) سرمایہ داری (سنہ ۳۷ء) خواب سحر (سنہ ۳۹ء) تبانِ حرم (سنہ ۴۶ء) اور آہنگ جنوں (سنہ ۴۵ء)۔

---

[۱] علی گڑھ میگزین مجاز نمبر

انتقال کے بعد شائع ہوئی) شامل ہیں۔ کچھ نظمیں بالکل غزل کی ساخت اور تکنیک کی ہیں۔ اس قسم کی جوش کی نظموں کو غزل نما نظم کہا گیا ہے۔ ان نظموں میں پہلا شعر غزل کے مطلع کے انداز کا ہے اور باقی شعر اسی ردیف قافیہ میں۔ یہ اختر شیرانی اور جوش کی محبوب تکنیک رہی ہے اور جوش کے یہاں تو ایسی نظموں کے آخری اشعار میں تخلص کا استعمال انھیں غزل کے مقطعے کی حیثیت دے دیتا ہے۔ مجاز کی ایسی نظموں میں آج کی رات (سنہ ۳۳ء) رات اور ریل (سنہ ۳۳ء) شوق گریزاں (سنہ ۳۴ء) تعارف (سنہ ۳۵ء) نذر دل (سنہ ۳۶ء) مجبوریاں (سنہ ۳۶ء) طفلی کے خواب (سنہ ۳۶ء) نوجوان سے (سنہ ۳۷ء) نوجوان خاتون سے (سنہ ۳۷ء) حسن و عشق (سنہ ۴۰ء) شہر نگار (سنہ ۴۲ء) عیادت (سنہ ۴۴ء) مادام (سنہ ۴۴ء) آج بھی (سنہ ۴۴ء) لکھنؤ (سنہ ۴۵ء) الہ آباد سے (سنہ ۴۵ء) آج (سنہ ۴۵ء) وطن آشوب (سنہ ۵۰ء) سانحہ (گاندھی جی کے انتقال پر (سنہ ۴۸ء) خراج عقیدت (سنہ ۵۱ء) زہر آب حسن (سنہ ۵۲ء) اور دنیا کشمیر اور کیوں (نذر جوش) شامل ہیں۔ آخر الذکر دونوں نظمیں مجاز کے انتقال کے بعد شائع ہوئیں اور ان کا سن تصنیف معلوم نہیں۔ باقی نظموں میں ۶ مصرعوں کے بند، چار مصرعوں کے بعد ایک مصرعے کی تکرار کے یا صرف چار مصرعوں کے بند اور تین مصرعوں کے بعد ایک مصرعے کی تکرار یا صرف تین مصرعوں کے بند پائے جاتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مجاز ہیئتی اور فنی نقطہ نظر سے نظم آزاد

نظم معریٰ یا جدید نظم کی بعض دوسری صورتوں کو آخر تک نہیں اپناتے وہ اس معاملے میں اپنے ہم عصروں سے نہ صرف یہ کہ بالکل الگ تھلگ ہیں بلکہ حفیظؔ اور ساغرؔ نظامی جیسے نئی تجربات سے بھی دامن بچاتے ہیں۔ نظم آزاد یا نظم معریٰ کی طرف مجازؔ نے بالکل توجہ کیوں نہیں کی اس کا جواب تلاش کرنے کے لئے ان کی ابتدائی غزلوں کی طرف لوٹنا ہوگا۔ اس سلسلے میں فرحت اللہ انصاری کے اس انکشاف کی بھی اہمیت ہے۔

"جب سبطے (سبط حسن) نے ۳۹-۳۸ء میں لال باغ لکھنؤ میں ترقی پسند ادب کا اشاعت گھر قائم کیا اور اپنی مقناطیسی شخصیت کے ارد گرد مجازؔ، جذبیؔ، سردارؔ اور دوسرے ساتھیوں کو بھی جمع کر لیا تو "آہنگ" کی ترتیب بھی پہلی بار دی گئی تھی۔ اس وقت جس غزل کے بارے میں جو سنہ یاد آیا یا ارتقائے کلام کی رو سے مناسب سمجھا گیا وہ اس پر ڈال دیا گیا اس طرح مجازؔ کے کلام میں ادوار تو بڑی ہوشمندی سے قائم ہو گئے اور فیضؔ احمد فیضؔ کو دیباچہ لکھنے کے لئے ساز و جام اور شمشیر و آہن کا مواد بھی اچھا فراہم ہو گیا مگر اس چمن بندی میں کتنے غنچہ ہائے شگفتہ و نا شگفتہ کا دانستہ یا نادانستہ خون بھی ہو گیا۔ اس کا علم لوگوں کو بہت کم ہے۔"[1]

---

[1] مجازؔ چند یادیں چند باتیں

جیسا کہ اس واقعہ کے تذکرہ کے سلسلے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ بعض نظموں کا آگے پیچھے کیا جانا مجاز کے کلام کے سلسلے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس کا دوسرا حصہ جو بعض نظموں غزلوں کے نہ شامل کئے جانے سے متعلق ہے یقیناً اہمیت رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے سبط حسن نے ابتدائی دور کی وہ غزلیں جو مشق کے طور پر مجاز نے آگرہ پہونچنے سے قبل لکھی ہوں مسترد کر دی ہوں اور مجاز نے "آہنگ" کے بعد کے اڈیشنوں میں انھیں خود بھی شامل کرنا مناسب نہ خیال کیا ہو۔ اس خیال کو تقویت ڈاکٹر محمد حسن کے اس انکشاف سے بھی ہوتی ہے کہ مجاز کی بہت سی غزلیں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں جو ان کے پاس ہیں[1] ظاہر ہے کہ یہ غزلیں بالکل ابتدائی دور کی ہوں گی ورنہ ان کی اشاعت رد کئے کا کوئی سوال نہ تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شروع میں انھوں نے غزل کے میدان میں خاصی محنت کی تھی تب جا کر انھیں منجھے منجھائے ہوئے مصرعے کہنے پر ایسی زبردست قدرت حاصل ہوئی تھی۔ آگرہ کا قیام بھی مجاز کے فنی اور ذہنی نوعیت کے اثرات قبول کرنے کے سلسلے میں بہت اہم تھا اور دو باتوں کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ انھوں نے فانی اور میکش[2] کی صحبتوں اور جذبی کی دوستی کے زیر اثر انداز بیان پر قدرت حاصل کرنے کے لئے جتنی محنت بھی کی ہو کم ہے۔ میکش اکبرآبادی کا

---

[1] راقم الحروف کے نام خط

خیال تھا کہ مجاز کامیاب شاعر نہیں ہو سکتے[1] اور وہ جذبی کی دیکھا دیکھی شعر کہتے ہیں میکش صاحب سے ان کے تقریباً دوستانہ مراسم تھے اور ظاہر ہے کہ وہ ان کی اس رائے سے واقف رہے ہوں گے۔ اس حالت میں انھوں نے میکش صاحب کی اس رائے کو غلط ثابت کرنے کے لئے اپنی غزلوں کو سنوارنے نکھارنے پر زیادہ توجہ دی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ فانی کے اس جملے پر کہ "حضرت آپ برسوں کی راہ ایک دن میں طے کرنا چاہتے ہیں۔" چڑھ گئے تھے اور فانی کی غزل پر غزل لکھ کے انھیں سنا بھی دی تھی[2]۔ یہ واقعہ بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مجاز نے آگرہ میں فنی مہارت حاصل کرنے کی سخت کوشش کی ہوگی۔ ان کی ابتدائی غزلیں جو ان کے مجموعہ کلام میں شامل ہیں اس بات کا ثبوت ہیں۔

حسن کو بے حجاب ہونا تھا
شوق کو کامیاب ہونا تھا

دکھا دے ایک دن اے حسن رنگیں جلوہ گر ہو کر
وہ نظارہ جو ان آنکھوں میں رہ جائے نظر ہو کر

---

[1] مجاز مرحوم۔ از میکش اکبرآبادی (علی گڑھ میگزین مجاز نمبر)
[2] مجاز سے متعلق ڈائری کے اوراق۔ ڈاکٹر محمد حسن (نقوش ۵۶-۶۵۵)

بتانے والے دہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

انٹرمیڈیٹ کے طالب علم کے لئے غزل میں اس قسم کے شعر کہنا فانی مرحوم کے الفاظ میں برسوں کی راہ ایک دن میں طے کرنا نہیں تھا تو اور کیا تھا بہرحال مجاز کو الفاظ کی صحت، انتخاب اور برمحل استعمال اور برجستہ، رواں مترنم، ڈھلے ڈھلائے مصرعے کہنے پر شاعری کے ابتدائی زمانے ہی میں بے پناہ قدرت حاصل ہوگی۔ شاعر نے مرصع سازی میں بھی کمال پیدا کر لیا جو عام مقبولیت حاصل کرنے والی پہلی نظم "نمائش" میں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔

جمال حسن کے یہ دلفریب تیور
نمایاں چاندسی پیشانیوں پر
وہ رخساروں پہ ہلکی ہلکی سرخی
لبوں پہ پرفشاں روح گل تر
سیہ زلفوں میں روح سنبلستاں
نظر سرچشمۂ تسنیم و کوثر

یہ وہ دولت تھی جو مجاز کے ہم عصروں کو شاعری کے ابتدائی زمانوں میں حاصل نہیں تھی۔ جدید اور آزاد نظم کے زیادہ تر شاعر غزل کے راستے پابند نظم اور بعد میں آزاد نظم تک پہونچے ہیں لیکن قادر الکلامی کی ایسی دولت لے کر ن۔ م۔ راشد۔ فیض احمد فیض وغیرہ میں سے کوئی بھی شاعری کے میدان میں نہیں اترا تھا۔ اس مہارت کا جوہر، یہ زور بیان بھرپور انداز میں پابند نظموں ہی میں نمایاں ہو سکتا تھا نظم آزاد کم از کم مجاز کی شاعری کے عروج کے زمانے تک اس ترقی یافتہ شکل میں مقبول نہ ہوئی تھی جس شکل میں اسے بعد میں راشد اور دوسرے شعرا نے مقبول بنایا۔ یہی خاص سبب تھا کہ مجاز نظم آزاد اور تکنیک کے جدید تجربوں کی طرف مائل نہ ہوئے ایک دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجاز یوں تو صرف مشاعروں کے شاعر نہ تھے لیکن مشاعروں سے وہ کبھی بے نیاز بھی نہیں رہے اور آزاد یا جدید نظم نہ مشاعروں میں ترنم کے ساتھ پڑھی جا سکتی تھی اور نہ ہی ان کے زمانے میں ہزاروں افراد پر مشتمل مجمع اس کے سننے کا عادی ہوا تھا۔ آج بھی مشاعروں میں کبھی کبھار ہی کوئی آزاد نظم کامیاب ہوتی ہے اس حالت میں بہت ممکن ہے مجاز کے دل میں خیال آیا ہو کہ اس چکر میں پڑ کر مشاعروں کی کامیابی سے کون ہاتھ دھوئے۔

اس میں شک نہیں کہ مجاز کے جدید فنی تجربوں سے گریز کرنے کے نتیجہ میں ان کی کچھ نظموں میں بھی جوش کی کچھ نظموں کی طرح ارتقائے خیال کے بجائے تکرار خیال کا عیب پیدا ہو گیا ہے یا بندوں کے مقررہ تعداد کے

مصرعوں کی ضرورت نے انھیں ایسے بھرتی کے مصرعے شامل کرنے پر بھی مجبور کیا ہے جو خیال کو آگے بڑھانے میں معاون نہیں ثابت ہوئے، یہ عیب ان کی سب سے مشہور نظم "آوارہ" تک میں موجود ہے۔ لیکن آزاد اور جدید نظم کے تمام تجربات کے باوجود ان کی پابند نظموں کو ادبی طور پر بھی مقبولیت حاصل ہوئی یہ دراصل بہت بڑا خراج تحسین تھا جو انھیں اس عہد نے پیش کیا۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ انداز بیان پر قدرت سے متعلق جوش کی روایت جدید شاعروں میں مجاز سے زیادہ رچی بسی شکل میں اور کسی کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ اس معاملے میں ان کے کلام میں رچی ہوئی فارسیت خاص اہمیت رکھتی ہے جو بعض الفاظ کو نئی معنویت عطا کرتی ہے جیسا کہ مجتبیٰ حسن نے رائے ظاہر کی ہے۔

"مجاز کے مخصوص انداز بیان اور فارسی شناسی نے ایسی علامات تراش کر نکالی گئی ہیں جو زبان زد ہو کر رہ گئی ہیں اور ادب ہی کا سرمایہ نہیں ہماری گنگا کا حسن بھی بن گئی ہیں مثلاً یہی "شہناز لالہ رخ" کا ٹکڑا جس کے ساتھ شگفتہ کاشانے کا تصور آجاتا ہے مجاز کے جنون زدہ ان کے "ختن" ان کے غزال سب ان کی اپنی تخلیق ہیں اور انھیں سے مختص ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ کسی فارسی تلمیح یا روایتی سلسلے کی کڑی نہیں ہیں یہ ایک بالکل نئی معنویت کی حامل ہیں۔

آج بھی ہے لکھی ہوئی سرخ حروف میں مجازؔ

دفترِ شہریار میں مرے جنوں کی داستاں

دفترِ شہریار میں جو داستان "سرخ حروف میں لکھی پڑی ہے" وہی مجازؔ کے ہاں شہریار کو روایتی معنوں سے ہٹا کر ایک نئی علامت بنا دیتی ہے۔ مجازؔ کے یہ تصرفات ایسے ہیں کہ اگر کوئی اپنانا بھی چاہے تو اپنا نہیں سکتا یہ مجازؔ کی مخصوص رنگینیٔ مزاج سے وابستہ ہیں جسے اپنایا نہیں جا سکتا۔ [1]

پھر مجازؔ کی وہ تشبیہات اور استعارے ہیں جو بقول آل احمد سرورؔ "ایک خلاقانہ ذہن ظاہر کرتے ہیں" [2] اور جن کے سلسلے میں ان کی شاعری کے متعلق اچھی رائے نہ رکھنے والے ناقدین نے بھی انھیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے مثلاً اسلوب احمد انصاری کی رائے ہے۔

"نادر تشبیہوں کی تلاش جو ذہن میں تازگی اور نظر میں وسعت پیدا کرنے میں ممد ہوتی ہیں مجازؔ کے شاعرانہ عمل کا ایک خاص وصف ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی۔" [3]

---

[1] مغنی تبسم نفسِ مجازؔ ایک آہنگ

[2] علی گڑھ میگزین مجازؔ نمبر

[3] " "

چمک تاروں کی چشمِ سرمگیں میں
جھلک چاندی کی جسمِ مرمریں پر

نشاطِ رنگ و بو سے چور آنکھیں
شرابِ ناب سے لبریز ساغر

سحر و اعجاز لئے جنبشِ مژگانِ دراز
خندۂ شوخ جمالِ درخوش آب لئے
نشۂ ناز جوانی میں شرر اور ادا
جسم ذوقِ گہر و اطلس و کمخواب لئے
زلف شب رنگ لئے صندل و عود و عنبر
خمِ ابروئے حسین دیر کی محراب لئے

یہ مدھ بھری چھاؤں، یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال

اس کے ساتھ ہی مجاز کی اس فنی مہارت کے سلسلے میں یہ بات
بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ اپنے اندر واضح ارتقائی نقوش نہیں رکھتی۔ ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ قدیم شعری سرمایہ سے گہرے لگاؤ اور نیم کلاسیکی طرزِ ادا

سے پیدا ہونے والی دلچسپی نے انھیں شروع ہی میں خوبصورت فارسی ترکیبوں کے سہارے ڈھلے ڈھلائے رواں اور چست مصرعے لکھنے پر قدرت عطا کر دی تھی۔ آگے چل کر یہ بات ان کے شاعرانہ معمول میں داخل ہو گئی اور یہ شروع سے آخری زمانہ کی تخلیقات تک تقریباً یکساں طور پر برقرار رہی۔ لیکن ان کے اسلوب میں لب ولہجہ کے اعتبار سے ارتقائی مراحل کا سراغ ملتا ہے "نمائش" سے لے کر "پردہ اور عصمت" تک بیانیہ اور بات کہنے کا براہ راست انداز ۱۹۳۷ء کی نظم "آوارہ" میں بدل جاتا ہے اور یہاں سے لب ولہجہ کے اعتبار سے ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔ ناخوشگوار حالات اور ان کے سیاسی اور سماجی اسباب کا شعور شخصیت کے اندر جو سوز و گداز پیدا کرتا ہے اس کی پرچھائیاں انداز بیان پر بھی پڑتی ہیں۔ اب شاعر کسی کیفیت یا جذبے کے براہ راست اظہار کے بجائے ایک بالواسطہ انداز اختیار کرتا ہے اور نظم کا آغاز ان سوالات سے ہوتا ہے۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں؟
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں؟

نظم شروع کرنے کا یہ خوبصورت انداز اس سے قبل مجاز کے یہاں نہیں ملتا۔ ان سوالات نے ایک طرح سے نظم کے پورے موضوع پر روشنی ڈال دی ہے۔ بعد میں "خواب سحر" کے اندر یہ لب ولہجہ کچھ اور زیادہ نکھرے ہوئے انداز میں ملتا ہے آوارہ کی بہ نسبت یہ لب ولہجہ زیادہ منفرد بھی

بھی ہے اور سنجیدہ بھی۔ یوں تو یہ شعر کے علیحدہ علیحدہ ہم قافیہ ہونے والی پرانی ٹکنیک کی نظم ہے لیکن اس کا مخصوص لب و لہجہ اسے مجاز کی کامیاب نظموں کا درجہ دے دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر تنہائی میں سوچ رہا ہے اس کے ذہن میں انسان کے ارتقا کی مختلف تصویریں ابھرتی اور ڈوب جاتی ہیں اور آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ ظلم، جہل اور اوہام کی رات میں انسان نے کچھ نہ سہی ایک نئی سحر کا خواب تو دیکھا ہے یہ نظم اتنا خوبصورت لب و لہجہ نہ رکھتی تو محض پروپیگنڈہ بن کر رہ جاتی۔

اس نظم کے بعد سے مجاز بہ اعتبار ٹکنیک، اپنی آواز کو پا لیتے ہیں اور بعد کی زیادہ تر نظمیں مصرعوں کی تعداد یا ترتیب کے لحاظ سے روایتی ہونے کے باوجود ایک انفرادی شان رکھتی ہیں نظم شروع کرنے کا انداز اور عام لب و لہجہ انھیں ان کے زمانے کی دوسری پابند نظموں سے ممتاز کرتا ہے ان کی نظموں کے ابتدائی مصرعے خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں جن سے خیال کی سمت و جہت بھی متعین ہوتی ہے اور عام موڈ اور انداز فکر کی بھی نشان دہی ہوتی ہے مثلاً۔

"مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں

رخصت اے ہم سفر و شہر نگار آ ہی گیا (شہر نگار)

یہ کون آگیا رخ خنداں لئے ہوئے (عیادت)

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں (آج بھی)

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو (اعتراف)

آج کی رات اور باقی ہے (مہمان)

سبزہ و برگ و لالہ و سرو و سمن کو کیا ہوا (وطن آشوب)

حیثیت فن کے میدان میں مجاز نے نئے تجربے تو یقیناً نہیں کئے لیکن جو کچھ کیا وہ انھیں انھوں کے بس کی بات نہ تھی۔ انھوں نے شاعری کو سیاست نہیں بننے دیا۔ سیاست کو شاعری بنا دیا ان کے اس کارنامے کو ممتاز حسین نے یوں سراہا ہے۔

"محسوسات کے خانوس میں جو لفظ بھی ان کی نوک زبان سے جھلکا وہ موجہ رنگ و بو سے پرافشاں رہا۔ جو نغمہ بھی اس کی شاخ دل سے پھوٹا وہ ایک سیل نور میں غلطاں رہا۔" [1]

---

[1] حریف جبریل (مجاز ایک آہنگ)

مجازؔ شباب اور انقلاب کے شاعر

۱۔ تصوّرِ عشق

مجازؔ شباب اور انقلاب کے شاعر ہیں اور یہی دونوں ان کی شاعری کے خاص موضوع ہیں جہاں تک شباب کا تعلق ہے جب تک ان کے ہاتھوں میں ساز اور ہونٹوں پر گیت لہراتے وہ زندگی کی اس منزل کے گیت گاتے رہے۔ شاعری کے آخری زمانے تک ان کے اندر "شباب خوگرِ دارو رسن" کا عزم اور بانکپن "رہزنِ ایوانِ خوباں کی سرکشی اور عمر بھر کی شکستوں، ناکامیوں اور محرومیوں کے باوجود یہ کہنے کا حوصلہ باقی رہا۔

بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث

مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

اسی طرح جہاں تک انقلاب کا تعلق ہے ان کی شاعری آخر

تک اس نصب العین کا احترام کرتی رہی وہ شاعر کی حیثیت سے زندگی کے آخری زمانہ تک مرد انقلابی رہے انھوں نے ذہنی اور فکری طور پر نہ انقلاب کے نصب العین کو ترک اور نہ ہی کسی قسم کی مصلحت پسندی کا شکار ہوئے (ہارڈنگ لائبریری کی ملازمت کے سلسلے میں بھی سجاد ظہیر سے مشورہ کیا اور اس خیال سے مطمئن رہے کہ یہ سرکاری نوکری نہیں ہے) [1] یہی سبب تھا کہ ان کی شاعری میں یہ دونوں عناصر سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئے اور ان کے زیادہ موضوعات شباب اور انقلاب سے متعلق جذبات و کیفیت یا افکار و مسائل سے براہ راست یا بالواسطہ وابستہ ہیں۔

شباب کا جو تصور مجاز کو عزیز تھا اس میں رومانوی اور انقلابی دونوں پہلو کچھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ انھیں کسی مرحلے پر بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا وہ اپنی زمزمہ سنجی و نغمہ خوانی کے سلسلے میں 'محفل وفا' اور 'بزم دلبراں' دونوں کو اہمیت دیتے ہیں۔

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں

شاعر محفل وفا مطرب بزم دلبراں

"یہاں شاعر محفل وفا" کے ٹکڑے میں بے پناہ وسعت اور معنویت ہے مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد مجاز کے عام لب و لہجہ اور مزاج کے پس منظر میں باغیوں اور سرکشوں کے گیت گانے سے ہے۔

---

[1] محمد رضا انصاری کے نام ۸ مئی ۱۹۴۳ء کا ایک خط۔

ان کی شاعری کے تجزیے کے وقت ان دونوں پہلوؤں کو بیک وقت ذہن میں رکھنا ہے۔ لیکن کچھ تو مطالعہ کی آسانی کے لئے اور کچھ اس لئے کہ ادب اور زندگی دونوں میدانوں میں ہمارے یہاں شباب اور انقلاب کے تذکرے سے دو مختلف قسم کے تصورات ذہن میں ابھرتے ہیں ایک ساز و جام اور حسن و عشق کا دوسرا شمشیر و سناں اور دار و رسن کا شباب کے مطرب اور انقلاب کے نقیب کی حیثیت سے مجاز کی شاعری کا الگ الگ جائزہ لینا مناسب ہوگا۔

مجاز کے شباب سے متعلق نظموں میں سب سے زیادہ ان کی عشقیہ شاعری اہمیت رکھتی ہے اس حصہ میں ان کی بعض ایسی کامیاب نظمیں بھی شامل ہیں جن کا شمار اردو کی بہترین نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری ان سے قبل کی اردو کی زیادہ تر عشقیہ شاعری سے اس لحاظ سے مختلف اور منفرد ہے کہ یہ اپنے اندر اپنے عہد کے سماجی حالات کا واضح اور حقیقت پسندانہ شعور بھی رکھتی ہے۔ مجاز کو اشتراکی خیالات سے ذہنی ہم آہنگی اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستگی نے غیر عشقیہ شاعری کے لئے جو مواد اور شعور دیا تھا اس سے مجاز نے اپنی عشقیہ شاعری میں بھی اہم فائدہ اٹھایا۔ اور ان کی عشقیہ نظموں کو اس سماجی بصیرت نے ایک نئی شان عطا کر دی۔ مجاز نے اس سماجی بصیرت اور حالات کے حقیقت پسندانہ شعور کے آئینے میں محبت کی محرومی اور ناکامی کو دیکھا اور دکھایا اور یہی سبب ہے کہ ان کی محبت کے جس المیے نے ان کی زندگی کو اندر ہی اندر گھلا

کرکے شراب خانوں میں پھینک دیا وہ ان کی شاعری کو مایوسی اور قنوطیت کا شکار نہ کر سکا۔

مجازؔ سے قبل اردو شاعری کو اختر شیرانی سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ کے روپ میں حقیقی جاگتی محبوبہ عطا کر چکے تھے لیکن اختر شیرانی کے عشقیہ نغمے اپنی تمام رنگینیوں، رعنائیوں اور وارفتگی کے باوجود کوئی خاص سماجی پس منظر نہیں رکھتے۔ عشق کے نتیجہ میں "بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں" سے زیادہ سماجی فضا ان کے یہاں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ اختر شیرانی اپنی مشہور نظم "جہاں ریحانہ رہتی تھی"۔ یا ایک دوسری نظم "انتظار" میں (سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں) جس وادی کا نقشہ کھینچتے ہیں یا "اے عشق کہیں لے چل" میں حسن و عشق کی جس دنیا کی تصویر کشی کرتے ہیں وہ اختشر اور نبوی کے الفاظ میں "ایک نوآبادی ہے جس کو ہم کی (اختر شیرانی کی) رومانیت نے دنیائے مثال میں بسایا ہے [1]"۔ مجازؔ اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں اختر شیرانی کی رومانیت سے متاثر ہوئے تھے مگر خوش قسمتی سے ان کے دل و دماغ کو نئی تحریکوں نے نئی راہیں دکھا دیں اور وہ اختر شیرانی کے ان خواب زاروں میں بھٹکنے سے بچ گئے۔

عشق کے معاملے میں اختر شیرانی کی خوابوں کی بستی سے مجازؔ کی حقیقت کی دنیا کتنی مختلف ہے اس کا اندازہ ان کی پہلی ہی کامیاب عشقیہ نظم آج کی رات سے ہوتا ہے۔ جہاں سید احتشام حسین کے الفاظ

---

[1] دیباچہ کلیات اختر شیرانی

میں" واقعہ جذبے کی صداقت سے ہم آہنگ ہے اور اس کا اظہار نفسِ مضمون سے مطابقت رکھتا ہے۔ حسن رنگینی مسرت اور مستی کا سیلاب یہ بھی اس حقیقت کو غرق نہیں کر سکا کہ محبت کے ایک تجربے نے سنگ ریزوں کو گہر میں اور رہگذر کو کہکشاں میں تبدیل کر دیا ہے[1] اس کے یہ شعر بھی اس سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں۔

عارض گرم پہ وہ رنگ شفق کی لہریں
وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات
مری ہر سانس پہ وہ ان کی توجہ کیا خوب
میری ہر بات پہ وہ جنبش سر آج کی رات

پھر "نذر دل" سامنے آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اردو شاعری کو یہ کیسا عاشق ملا ہے جو محبوب سے بات کرتے وقت بھی اپنی سرکشی کا تذکرہ کیئے بغیر نہیں رہ سکتا اور جو اسے "انقلاب تازہ تر" پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے یہ دعوت اس عہد کی عام سیاسی بیداری کی آئینہ دار ہے۔

"دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں
میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں

---

[1] مجاز کی شاعری میں رومانی عنصر

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

جس زمانے (سنہ ۳۶ء) کی یہ نظم ہے اسی زمانے کی ایک اور نظم "مجبوریاں" تصویر کے دوسرے رخ کو پیش کرتی ہے کہاں تو عزم و یقین کا یہ عالم تھا کہ

میں قسم کھاتا ہوں اپنے نطق کے اعجاز کی
تم کو بزم ماہ و انجم میں بٹھا سکتا ہوں میں

اور کہاں اب یہ عالم ہو گیا۔

کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا

"نذر دل" ایک باغی اور سرکش نوجوان کا حسن کے قدموں میں نذرانۂ عقیدت ہے اور "مجبوریاں" ان سماجی حالات اور روایات کو بے نقاب کرتی ہے جن میں محبت کے پروان چڑھنے کی راہ میں ان گنت دشواریاں حائل ہیں۔

نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اس قصر حسیں تک جا نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا

حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام تک پہونچا نہیں سکتا

ان حالات کے خلاف سب سے سخت ردعمل "ادارہ" میں ملتا ہے ایک طرف شہر کی جگمگاتی جاگتی رات ہے ہر طرف رنگینیاں اور رعنائیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ہر قدم پر عشرتیں انگڑائیاں لے رہی ہیں اور دوسری طرف عشق کی ناکامی ہے اور زندگی کی محرومیاں۔ ساتھ ہی ساتھ عہد وفا نے پاؤں میں زنجیریں بھی ڈال رکھی ہیں ان حالات میں سڑکوں پر بے مقصد منڈلاتے ہوئے بغاوت کا احساس دل میں کروٹیں لیتا ہے۔ بغاوت کا یہ احساس پہلے تو خود محبت اور محبوبہ کے خلاف ہوتا ہے لیکن دبا دبا سا ہے۔

جی میں آتا ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں!

لیکن "عہد وفا" توڑنے کے تصور ہی سے غم کچھ اور بڑھ جاتے ہیں اور دل میں ایک شعلہ بھڑک اٹھتا ہے اور پھر اس بغاوت کا رخ اس نظام کی طرف مڑ جاتا ہے جو ان ناسازگار سماجی حالات کا ذمہ دار ہے۔

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں

کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

"مجبوریاں" کا اداس لب ولہجہ اور "ارادہ" کی جھنجلاہٹ ایسا لگتا ہے کہ وقتی چیز تھی جس پر شاعر نے جلد ہی قابو پالیا اور "گریز" میں دل اور روح کے زخمی ہونے کے باوجود اسے ایک بار پھر "نذرِ دل" والا اعتماد حاصل ہو گیا اور اس نے واضح طور پر اعلان کر دیا۔

یہ جا کر کوئی بزمِ خوباں میں کہہ دو
کہ اب درخورِ بزمِ خوباں نہیں میں
مبارک تمھیں قصر و ایواں تمھارے
وہ دلدادۂ قصر و ایواں نہیں میں
جوانی بھی سرکش، محبت بھی سرکش
وہ زندانیِ زلفِ پیچاں نہیں میں

عشق کا یہ تصور اپنے دو تین پہلوؤں کی وجہ سے اردو شاعری کے لئے نیا بھی تھا اور حقیقت پسندانہ بھی۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ محبوبہ اردو شاعری کے روایتی محبوب کی طرح نہ ظلم، جبر اور بے وفائی کا پیکر بن کر سامنے آتی ہے اور نہ ہی "شاہدِ بازاری" کی طرح عاشق کا دل جلانے کے لئے ناز و غمزے سے کام لے کر دوسروں سے التفات برتتی ہے ا
اور نہ ہی وہ اختر شیرانی کی محبوبہ کی طرح آسمانی

خواب[1] کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ "میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے"۔ مجاز نے اپنی خوبصورت نظم "کس سے محبت ہے" میں "اس دنیا کی عورت" کی جو تصویر کھینچی ہے ویسی تصویر اردو شاعری میں اس سے قبل شاید ہی کبھی پیش ہوئی ہو۔

وفا خودکی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
میرا ہر شعر تنہائی میں اس نے گنگنایا ہے

سنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اس کی

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں

مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اس کی

لب لعلیں پہ لالی ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبیں نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اس کا تبسم اس کا گہنا ہے

ہنسی آلودہ ظلمت سحر دامانیاں اس کی

---

[1] تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ (کلیات اختر شیرانی)

وہ عاشق کی آمد پر اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔

خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگام سحر[1]

اپنی آنکھوں میں لیے شب کا خمار آہی گیا

زلف کا ابر سیہ بازوئے سیمیں پہ لیے

پھر کوئی زخمہ زن ساز بہار آہی گیا

ہوگئی تشنہ لبی آج رہین کوثر

مرے لب پر لب لعلیں نگار آہی گیا

اور عاشق کی عیادت کے لئے آتی ہے تو لطف و عنایت کا پیکر بنی ہوگی۔

بیمار کے قریب بصد شان احتیاط

دلداری نسیم بہاراں لئے ہوئے

اک اک ادا میں سینکڑوں پہلوئے دلدہی

اک اک نظر میں پرسش پنہاں لئے ہوئے

ملتی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی

کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لئے ہوئے

یہ کون ہے مجاز سے سرگرم گفتگو

دونوں ہتھیلیوں میں زنخداں لئے ہوئے

---

[1] "بیاد بسنت" حلقہ کے ایک رکن جن کے سردار، مجاز اور سبطے وغیرہ سے دوستانہ مراسم تھے راوی تھے کہ ایک بار مجاز لکھنؤ سے علی الصباح دہلی پہونچے تھے اور جہاں قیام کرنا تھا وہاں پہونچ کر دروازے پر دستک دی تو وہی خاتون دروازہ کھولنے [illegible] نظم اسی واقعہ کی یادگار ہے۔

مجاز کے تصورِ عشق کے سلسلے میں دوسرا اہم عنصر خود عاشق اور اس کا رویہ ہے۔ مجاز کی شاعری میں پائے جانے والے محبوبہ کے تصور ہی کی طرح عاشق کا تصور بھی دوسرے شعرا کے تصور سے مختلف ہے یہاں نہ عاشق روایتی ہے اور نہ ہی اس کا عمل اور رد عمل اردو شاعری کے روایتی عاشق کا جیسا ہے۔ یہ عاشق مجاز کے زمانے کا بیدار، باشعور اور سرکش نوجوان ہے جو زیادہ تر مواقع پر اپنے عہد کی بیداری اور سرکشی کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔

نشۂ نرگسِ خوباں مجھ سے
غازۂ عارض و رخسار ہوں میں
رشکِ صد ہوش ہے مستی میری
ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں
دیر و کعبے میں مرے ہی چرچے
اور رسوا سرِ بازار ہوں میں
مجھ سے برہم ہے مزاجِ پیری
مجرمِ شوخیٔ گفتار ہوں میں
محفلِ دہر پہ طاری ہے سکوت
اور وارفتۂ رفتار ہوں میں

آج بھی خار زارِ غم خلد بریں میرے لئے
آج بھی رہگذارِ عشق میرے لئے ہے کہکشاں

آج بھی ہے زباں مری خنجر بے نیام شوق
بحث طلب آج بھی جرأت و شوخی بیاں

مجاز کی شاعری میں عاشق کامرانی و کامیابی پر نشاطیہ اور طربیہ گیت چھیڑتا ہے لیکن ان مواقع پر بھی زندگی کے دوسرے مسائل ذہن میں رکھتا ہے اور انقلاب کی جدوجہد میں محبوبہ کی شرکت کا خواہاں ہے (بعد میں دوسرے ترقی پسند شاعروں نے محبوبہ کے اس رول پر "اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے" کہتے ہوئے جو زور دیا اس کا ابتدائی نقوش مجاز کا ہی دیا ہوا ہے) اور جب محبوبہ زندگی کی جدوجہد میں ساتھ نہیں دے پاتی اور نتیجہ ناکامی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو عاشق بے وفائیوں کا رونا رونے اور "زہرہ جبینوں" سے شکوہ کرنے کے بجائے زمانے کے "نظام زنگ آلودہ" اور "آئین فرسودہ" کا شکوہ کرتا ہے۔ اور تمام تلخ واقعات کے بعد محبوبہ کی یاد آتی ہے تو اس میں تلخیاں شامل نہیں ہوتیں۔

مرے بازو پہ جب وہ زلف شبگوں کھول دیتی تھی
زمانہ نکہت خلد بریں میں ڈوب جاتا تھا

وہ میرا شعر جب میری ہی لے میں گنگناتی تھی
مناظر جھومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا

مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب مسکراتی تھی
مرے ظلمت کدے کا ذرہ ذرہ جگمگاتا تھا

اور "محبت بھی سرکش جوانی بھی سرکش۔ وہ زندانی زلفِ پیچاں نہیں ہیں" کہہ کر ناکامیوں اور محرومیوں کی دلدل سے آگے بڑھ جاتا ہے جیسے تیر کھا کر گرنے والا مجاہد شانے جھٹک کر اسی آن بان سے اٹھ کھڑا ہو جیسے کہ زخم نے اسے کچھ اور توانائی بخش دی ہے۔

عشق کے معاملے میں ساری ناکامیوں کے باوجود مجاز کی عشقیہ شاعری میں رجائیت کے عناصر در اصل اس کے سیاسی اور سماجی شعور کی پیداوار ہیں جس کی طرف اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا ایک سبب وہ بھی ہو جس کی نشان دہی علی جواد زیدی کی اس رائے سے ہوتی ہے۔

"سنہ ۱۹۳۵ء کے بعد اس کے شعر کے صرف دو مقصود تھے

آزادی اور نازنینانِ حرم۔ یہ آزادی تو اسے سنہ ۱۹۴۷ء میں مل گئی لیکن نازنینانِ حرم کبھی نہ ملیں۔ اس کی مصیبت ایک یہ تھی کہ وہ کسی ایک کا عاشق نہیں تھا۔ ہر قبول صورت اس کی توجہ کا مرکز تھی ان میں بہت سی ایسی ہستیاں تھیں جو اس کی شاعری کی گرویدہ تھیں۔ خلوتوں میں اس کے شعر گنگناتی تھیں لیکن مجاز کے لئے نہیں۔ کسی اور محبوب کے لئے۔ وہ متوجہ تو ہر ایک کو کر لیتا تھا لیکن کسی ایک کا ہو کے نہیں رہ پاتا تھا جو لوگ اس کی نظروں

کے پس منظر سے واقف ہیں انھیں معلوم ہے کہ کالجوں کی طالبات سے لے کر سن رسیدہ مادران گرامی تک اس کی نظموں کا موضوع بن چکی ہیں وہ کسی سے کچھ اور نہیں چاہتا تھا۔ صرف ایک محبت بھری نگاہ، ایک پیار بھرا تبسم اور کچھ لگاوٹ بھری گفتگو، بیشتر اس سے زیادہ کچھ طلب نہیں کیا اسی لئے اکثر جو مانگا وہ اکثر مل بھی گیا۔ اس کی عشقیہ شاعری میں جو روح کی آسودگی نظر آتی تھی اس کا اصل سبب یہی تھا" ؎

مجاز کی عشقیہ شاعری کے تجزیے میں ابھی تک ان کی سب سے کامیاب اور اہم نظم کا تذکرہ نہیں آیا یہ نظم ہے "اعتراف" جو دراصل ان کی محبت کی ناکامی کا نوحہ ہی نہیں بلکہ ایک دور، ایک نسل کے خوابوں کی شکست کی داستان بھی ہے۔ مجاز سے متعلق زیادہ تر مضامین میں اس کو سراہا گیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس کے متعلق لکھا ہے

"جشن سالگرہ سے لے کر" ایک غمگین یاد" تک جو مکمل عورت مجاز کی محبت اور پرستش کا محور رہی ہے وہ ایک بار پھر نمودار ہوتی ہے لیکن اس وقت جب پانی سر سے گزر چکا تھا اور زندگی کے نشے سے چور رہنے والا مجاز محض ایک خاک کا ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا۔ مومن کا یہ شعر

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب ۔ تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

؎ تاثرات (قومی آواز مجاز نمبر)

ممکن ہے محض تخئیل کی پیداوار ہو لیکن مجاز کی نظم "اعتراف"
اس کیفیت کا ایسا کرب انگیز اظہار ہے جس کی شدت اور بے پناہ
تاثر ہماری شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔"[1]

یہ نظم ۱۹۴۵ء میں اس موقع کی یادگار ہے جب یہ خاتون دہلی
سے لکھنؤ آئی تھیں اپنے تصور اور عشق کے سلسلے میں یہ مجاز کی دوسری نظموں
سے مختلف ہے یہاں شاعر اپنے ماضی کے ارمانوں، امنگوں اور حوصلوں پر
نگاہ ڈالتا ہے ان خوابوں کو یاد کرتا ہے جو ایک ایک کرکے چور ہوئے ان
ناکامیوں کے بارے میں سوچتا ہے جن میں ہر کیفیت پنہاں تھیں ان راستوں کی
طرف مڑ کر دیکھتا ہے جن پر عشق کی ناکامیوں نے اسے لا ڈالا تھا اور جن پر
چلتے چلتے زندگی اپنا سارا حسن، ساری معصومیت سارا بانکپن کھو بیٹھی اور
محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو"

اب میں تمھیں کیا نذر کر سکتا ہوں اب مرے پاس کیا باقی ہی کیا رہ
گیا ہے۔ زندگی اپنے معنی و مفہوم کھو چکی ہے "اب" میں وفادار نہیں ہاں
میں وفادار رہتی"۔

اگر نظم کی اشاریت اور رمزیت کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ
مجاز کے انفرادی زندگی کے المیہ سے بڑھ کر ان کے عہد اور ان کی نسل کے

---

[1] علی گڑھ میگزین مجاز نمبر

کے المیہ کی ترجمانی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کیوں کہ مجازؔ کے جو خواب چکنا چور ہونے ان کے جن ارمانوں کا خون ہوا ، ان کے جو نغمے ادھورے رہ گئے وہ اکیلے انھیں کے نہ تھے انقلاب کی آمد کا یقین ، سرمایہ داری کے خاتمے کا خواب ، ملک میں ایک خاص قسم کی زندگی کی آرزوئیں جوان کی نسل کے جوانوں کو عزیز تھیں سب پر پانی پھر چکا تھا زندگی اچانک کچھ عجیب مہمل سی نظر آنے لگی تھی زندگی کی اس "مہملیت" کا "اعتراف" نغمے ابتدائی حصے تو حریف کر رہ گئے ہیں ، سوال اجتماعی محرومی اور مایوسی کا نہ ہوتا اور بات صرف عشق کی ناکامی تک محدود ہوتی تو مجازؔ اتنے دردناک لہجے میں نہ چیخ اٹھتے ۔

"میں وفادار نہیں ، ہاں میں وفادار نہیں" !

۲۔ تصورِ انقلاب

انقلاب کے نقیب کی حیثیت سے مجازؔ کی شاعری اور ان کے تصورِ انقلاب کے متعلق دو متضاد قسم کی رائیں ملتی ہیں ایک رائے یہ ہے کہ مجازؔ نے اس میدان میں اپنے فرائض سیاسی اور سماجی بصیرت، شاعرانہ خلوص اور فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے کامیابی کے ساتھ انجام دیئے ہیں اس سلسلے میں فیض احمد فیضؔ کے اس خیال سے کہ "مجازؔ انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں مطرب ہے"[1] زیادہ تر ترقی پسند ناقدین مثلاً سید احتشام حسین، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، مجتبیٰ حسین وغیرہ نے اتفاق ظاہر کیا ہے دوسری رائے یہ ہے کہ مجازؔ انقلابی شاعر کی حیثیت سے زیادہ کامیاب شاعر نہیں ہیں اور ان کا انقلاب کا تصور تخریبی زیادہ تعمیری کم ہے۔ غیر ترقی پسند ناقدین کی اس رائے کی ترجمانی سب سے سخت لہجے میں اسلوب احمد انصاری نے کی ہے۔

---

[1] دیباچہ آہنگ

"مجاز کی بیشتر انقلابی نظمیں اعلیٰ اور کامیاب شاعری کے معیار پر پوری نہیں اترتیں کیوں کہ ان نظموں میں وہ شاعر کے منصب کا احترام کم کرتے ہیں۔ انقلاب کا ڈھنڈورا زیادہ پیٹتے ہیں۔"

"مجاز کا انقلاب کا تصور سراسر جذباتی ہے جو صرف ایک بے معنی تخریب پر منتج ہوتا ہے۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کو انقلاب کا جو تصور جوش نے دیا تھا اسے مجاز نے بغیر کسی تنقیدی محاکمے کے قبول کر لیا ہے اور چوں کہ وہ طبعاً غور و فکر کے عادی نہیں ہیں اس لیے نہ اس کے حسن و قبح پر نظر پڑتی ہے نہ اس میں وہ کوئی ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں۔" لہ

ان متضاد رایوں پر اظہار خیال سے قبل انقلاب کے اس تصور کا جائزہ لینا ناگزیر ہو جاتا ہے جو مجاز کی شاعری میں ملتا ہے اس سلسلے میں ان کی پہلی اہم نظم "انقلاب" ہے جس میں ملک کی آزادی اور "سرخ آندھی" کی آمد کا پیغام دیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے چار مرحلوں پر زور دیا ہے۔

لہ مجاز۔ از اسلوب احمد انصاری (علی گڑھ میگزین مجاز نمبر)

(۱) مسلح جدوجہد شروع ہونے کے آثار

ابر کے پردوں میں سازِ جنگ کی آواز ہے

بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دراتے ہوئے

---

(۲) سرمایہ داری نظام کا خاتمہ

ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام

(۳) مزدوروں کا جوشِ انتقام اور انقلاب کی مسلح جدوجہد کے دوران ہونے والا خون خرابہ۔۔

رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام

گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستون
خون بن جائے گی شیشوں میں شرابِ لالہ گوں

جھونپڑوں میں خون، محلوں میں خون، شبستانوں میں خون
دشت میں خون، وادیوں میں خون، بیابانوں میں خون

---

(۴) آمدِ انقلاب

کوہساروں کی طرف سے سرخ آندھی آئے گی

جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں کے اسیر

اس طرح لے گا زمانہ جنگ سے خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگ شفق
اور اس رنگ شفق میں با ہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

"شوق گریزاں" میں مرد انقلابی کا یہ تصور ملتا ہے

دیر و کعبہ کا میں نہیں قائل
دیر و کعبہ کو آستاں نہ بنا
بجلیوں سے جہاں نہ ہو چشمک
اس گلستاں میں آشیاں نہ بنا
مری خود داریوں کا خون نہ کر
مطرب بزم دلبراں نہ بنا

"تعارف" میں یہ تصور اور زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

مجھ سے برہم ہے مزاجِ پیری
مجرمِ شوخیٔ گفتار ہوں میں
حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں
نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں

اور "نوجوان خاتون سے" میں اس کا مشورہ یہ ہے۔

سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

"آوارہ" میں اس پورے نظام کو درہم برہم کر دینے کے شدید جذبات کی ترجمانی ملتی ہے جو ان باغی جوانوں کے سینے 'مفلسی' بے روزگاری اور محبت کی ناکامی کے تیروں سے چھلنی کرتا ہے۔

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے

لے کے ایک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں

تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں

"سرمایہ داری" اس سلسلے کی ایک اور اہم نظم ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام کے معاشی استحصال اور دوسرے غلط رجحانات کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے

غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہے
محل میں ناچتی ہے رقص گاہوں میں تھرکتی ہے

یہ اکثر لوٹ کر معصوم انسانوں کو راہوں میں
خدا کے زمزمے گاتی ہے چھپ کر خانقاہوں میں

اور آخر میں اس خیال کا اظہار بھی ملتا ہے

گرجتی گونجتی یہ آج بھی میداں میں آتی ہے
مگر بدمست ہے ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتی ہے

مبارک دوستو لبریز ہے اب اس کا پیمانہ
اٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیاد کاشانہ

"ہمارا تحفہ" میں انقلابی جدوجہد کرنے والوں کی یہ تقدیر لکھتا ہے۔

ہاں یہ سچ ہے بھوک سے حیران ہیں
پر یہ مت سمجھو کہ ہم بے جان ہیں
اس بری حالت میں بھی طوفان ہیں

اسی سلسلے کی ایک نظم "مزدوروں کا گیت" ہے

بننے کی تمنا رکھتے ہیں
مٹنے کا کلیجا رکھتے ہیں
سرکش ہیں سر اونچا رکھتے ہیں

"ادھر بھی آ" میں گزشتہ نگار دل آرا اور مست ساز و بربط نغمہ کو اپنے عہد کے عام حالات کا شعور حاصل کرنے، باغیوں کا زمزمہ آتشیں سننے اور تخریب کے دامن میں تعمیر کو دیکھنے کا مشورہ دیا گیا ہے اور آ منتظر بے خبر مست فردا "ادھر بھی آ" کا پیغام دیا گیا ہے۔ "خواب سحر" اس سلسلے کی ایک ایسی نظم ہے جس کو تجزیہ میں شامل کر لینے سے مجاز کا تصور انقلاب ایک لحاظ سے مکمل طور پر سامنے آجاتا ہے انقلاب روس کی

ایک سالگرہ کے موقع پر لکھی گئی۔ اس نظم میں مجاز نے انقلاب روس کو انسانیت کا "خوابِ سحر" قرار دیا ہے۔

متذکرہ بالا نظموں کے ساتھ ہی "شکوۂ مختصر"، "گرتہ" "آج بھی مجھے جانا ہے"۔ "اک دن" "بول اری او دھرتی بول" "پہلا جشن آزادی"، "وطن آشوب" اور "فکر" کو بھی مجاز کے تصورِ انقلاب کو سمجھنے کے سلسلے میں کسی نہ کسی حیثیت سے اہمیت حاصل ہے لیکن ۱۹۳۹ء کی نظم "خوابِ سحر" تک کی نظموں کو بھی سامنے رکھنے سے پوری تصویر ابھر آتی ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں

(۱) مجاز کے ذہن میں جس انقلاب کا تصور ہے وہ روسی انقلاب کی طرز کا ہے۔ (خوابِ سحر)

(۲) اس انقلاب کے لئے مجاز مسلح جد و جہد کو اہمیت دیتے ہیں (انقلاب، مسافر، اندھیری رات کا مسافر، نوجوان سے، نوجوان خاتون سے، آوارہ کے آخری بند اور سرمایہ داری کا آخری شعر

(۳) یہ مسلح جد و جہد غریبوں، مفلسوں، مزدوروں، کسانوں اور متوسط طبقہ کے باغی جوانوں کو کرنی ہے اور اس میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ حصہ لینا ہے (انقلاب، نوجوان سے، نوجوان خاتون سے، ہمارا جھنڈا اور مزدوروں کا گیت)

(۴) انقلاب کے لئے مسلح جد و جہد سے قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگا اور مزدوروں کا جوشِ انتقام سرمایہ دارانہ نظام کی اینٹ

سے اینٹ بجا کر رکھ دے گا۔ (انقلاب اور بعض دوسری نظموں کے اشعار)

(۵) اس انقلاب کے لئے فضا سازگار ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ تحریک شروع ہونے والی ہے اور انقلاب آنے ہی والا ہے۔ (انقلاب، سرمایہ داری)

مجاز کا یہ تصور انقلاب ان مختلف پہلوؤں کے ساتھ جو ان کی متذکرہ بالا نظموں میں پائے جاتے ہیں رومانوی تھا یا حقیقت پسندانہ؟ اس سوال پر بحث کرنے سے قبل بعض بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اول تو یہ کہ مجاز کی ایسی زیادہ تر نظمیں جن کی روشنی میں ان کی "انقلابی شاعری" پر بات کی جاتی ہے، دوسری عالم گیر جنگ کے خاتمے سے قبل لکھی جا چکی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجاز اشتراکی خیالات سے شدید طور پر متاثر تھے اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی عملی سیاست سے جذباتی طور پر قربت رکھتے تھے۔ دوم یہ کہ اس وقت تک کمیونسٹ انقلاب کے لئے عوامی سطح پر مسلح بغاوت ناگزیر تصور کی جاتی تھی۔ روس میں یونہی انقلاب آیا تھا اور چین میں اسی قسم کی جدوجہد جاری تھی۔ اس وقت تک فوجی انقلاب کے ذریعے، حکمراں سیاسی پارٹیوں کے اندر کمیونسٹ عناصر کے غلبہ کے ذریعے یا الیکشن کی کامیابی کے نتیجے میں کمیونسٹ حکومت کے قیام کے ذریعے انقلاب کا کوئی تصور ذہنوں میں نہ تھا۔ سوم یہ کہ دوسری عالم گیر جنگ سے قبل ہی

کانگریس کے اندر جو تحریک آزادی کی قیادت کر رہی تھی سوشلزم سے
متعلق خیالات زور پکڑنے لگے تھے اور کانگریس کے باہر بھی ایسے تعلیم یافتہ
نوجوانوں کی کمی نہ تھی جو ذہنی طور پر سوشلزم اور اشتراکی خیالات کے حامی
تھے اور مختلف انقلابی تحریکوں میں حصہ لے رہے تھے۔ چہارم یہ کہ ہندستانی
کمیونسٹ پارٹی کا نصب العین غلامی اور سرمایہ داری دونوں سے ملک کو نجات
دلانا تھا۔

آج کے حالات اس زمانے کے حالات سے بہت مختلف ہیں آج
انقلاب سے متعلق تصورات بھی بدل چکے ہیں اور کسی علاقے یا ملک میں
انقلاب کے لئے اختیار کئے جانے والے طریقوں کے سلسلے میں خود کمیونسٹ ممالک
اور مارکسی مفکروں کے نقطہ ہائے نظر میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس
کے ساتھ ہی عام انسانی مسائل کے حل کی حیثیت سے کمیونزم کی افادیت پر بھی
شکوک ظاہر کئے جا رہے ہیں روس اور چین کے درمیان سنگین نوعیت کے
اختلافات اور عالمی کمیونسٹ پارٹیوں کے ان اختلافات کے نتیجے میں مختلف
گروہوں میں بٹ جانے سے یہ خیال بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ ان اختلافات کی
بنیاد محض نظریاتی امور پر ہے یا یہ کہ ان کے پیچھے قومی اور علاقائی مفادات
کا بھی ہاتھ ہے اور اگر قومی مفادات اس جھگڑے کی جڑ ہیں تو کیا اس کا مطلب
کمیونسٹ بین الاقوامیت کے تصور پر قوم پرستی کے تصورات کی فتح نہیں ہے؟

آج کے ان حالات کے پس منظر میں مجاز کے تصور انقلاب کو تخریبی
قرار دینا آسان ہے لیکن سنہ ۳۰ء سے سنہ ۵۵ء تک کے حالات تصورات اور رجحانات

کی روشنی میں مجاز کے تصورِ انقلاب کا جائزہ لیا جائے تو ان پر یہ اعتراض اگر
صحیح ثابت ہوتا ہے تو صرف اسی حد تک جس حد تک اس عہد کے مخصوص سیاسی
نظریات پر صحیح ثابت ہو سکتا ہے ۔ یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ انقلاب کا
دوسرا طریقہ مسلح طبقاتی تصادم کے سوا اس وقت تک قابلِ قبول نہیں تصور کیا
جاتا تھا تو مجاز کے تصورِ انقلاب کے تخریبی پہلو پر نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی ۔ مجاز
کے عہد میں یا یوں کہنا چاہیے کہ اس عہد میں جب انھوں نے اس موضوع پر
نظمیں لکھیں ملک کے خاصے بڑے حلقے میں انقلاب کے لیے مسلح بغاوت کا نظریہ سب
سے زیادہ ترقی پسند سیاسی نظریہ تصور کیا جاتا تھا اور مجاز نے ایک حساس
اور باغی نوجوان کی حیثیت سے اپنے زمانے کے سرکش باغی جوانوں کے ولولوں اور
خیالات کی ترجمانی کی ۔ ظاہر ہے کہ مسلح تصادموں میں جو ملک گیر پیمانے پر
ہوتے ہیں بہت بڑے پیمانے پر تباہی و بربادی بھی آتی ہے قتل و غارت گری کے
بازار گرم ہوتے ہیں ، جھونپڑوں اور محلوں میں آگ لگتی ہے ، کھیت اور
کھلیان اجڑتے ہیں اور گھر سے لے کر میخانے تک انسانی سکون کے تمام مرکز
خون کی ندیوں کی زد میں آ جاتے ہیں اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا
جا سکتا ہے کہ انقلاب کن لوگوں کے ہاتھوں وجود میں آتا ہے ، کس طرح
وجود میں آتا ہے ۔ اور اس کی آمد کے سلسلے میں برسرِ اقتدار سیاسی طبقہ کے
خلاف مسلح بغاوت کتنے خون خرابے کا باعث بنتی ہے ان تمام امور کے سلسلے
میں مجاز کا تصور وہی ہے جو اس زمانے میں ایک خاص انداز سے سوچنے
والے نوجوانوں اور کمیونسٹ پارٹی کا تھا اور اس سلسلے میں ان کی ابتدائی

نظم "انقلاب" بھی جس کا اسی باب میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے۔ حقیقت
پسندانہ نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ کوئی شخص سیاسی نقطہ نظر سے ان
امور سے اختلاف رکھتا ہو تو وہ سرے سے انقلاب کی ضرورت ہی سے انکار
کرسکتا ہے لیکن آپ ایک بار انقلاب کی ضرورت تسلیم کرنے کے بعد متعلقہ
نظریات کو ظاہر ہے کہ غیر حقیقت پسندانہ نہیں کہہ سکتے۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس حقیقت پسندی یا حقیقت
نگاری میں خواب نوازی اور تخیل پرستی کے عناصر بھی شامل ہیں اور یہ
ایک ایسی بنیادی خامی ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جس ماحول میں
ان نظموں کی تخلیق ہوئی۔ جس عہد میں انقلاب کے یہ گیت گائے گئے۔
وہ دراصل انقلاب کے لئے نہ سازگار تھا اور نہ ہی ایسے کسی انقلاب کے آثار
نظر آرہے تھے کسی ملک میں مسلح طبقاتی تصادم کے ذریعے انقلاب لانے کے لئے
جس قسم کے حالات کو مارکس نے ضروری قرار دیا تھا وہ ۳۵ء کے ہندستان
میں موجود نہیں تھے۔ لیکن یہ مجاز کے تصور انقلاب کی بنیادی خامی ہے
کہ ان کی نظموں میں ایسے واضح اشارے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ
انقلاب کے لئے فضا بالکل سازگار ہے۔ مسلح جدوجہد اب شروع ہی ہونے
والی ہے سال دو سال میں انقلاب آنے ہی والا ہے اور سرمایہ داری نظام اب
ختم ہوا اب ختم ہوا۔ یہ دوسری جنگ عظیم سے قبل کے ہندستان کا نہایت
ہی رومانی اور تخیل پرستانہ تجزیہ تھا جسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ
نہ تھا اور اسی وجہ سے آل احمد سرور نے انقلاب کے اس تصور کو

"رومانی اور طفلانہ" قرار دیا ہے۔[1]

اس بنیادی خامی کے باوجود مجاز کا تصور انقلاب ان کے اپنے عہد کے بعض سیاسی رجحانات کا رہین منت ہے۔ جوش کا رہین منت نہیں اور وہ اس لیے کہ ان دونوں شاعروں کے تصور انقلاب میں بنیادی طور پر بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ مجاز کا انداز فکر عوامی اور جوش کا جاگیردارانہ ہے۔ مجاز کے نزدیک انقلاب کے ہیرو نچلے طبقات۔ کسان۔ مزدور اور متوسط طبقے کے باغی جوان ہیں جبکہ جوش کے نزدیک انقلاب کے ہیرو وہ خود ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"جوش کی انقلابی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ انقلاب کوئی وحی ہے جو ان پر اتر رہی ہے اور وہ اس کے پیغمبر اور نقیب بن کر آئے ہیں۔ قوم کی نجات انھیں کے ہاتھوں ہوگی وہ انقلاب کا ہیرو ایک فرد کو سمجھتے ہیں اور اکثر یہ ہیرو خود جوش ہی ہوتے ہیں۔

قسم اس جوش کی جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا
کہ اے ہندوستان جس وقت تو مجھ کو پکارے گا
مری تیغ رواں باطل کے سر پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی[2]

۱؎ علی گڑھ میگزین مجاز نمبر ۲؎ فکر و فن

مجاز مزدوروں اور کچلے ہوئے مفلس عوام کی مشکلات کے نوحے نہیں لکھتے۔ ان کے اس انقلابی عزم کو اہمیت دیتے ہیں جو ان مشکل حالات میں بھی ان کے اندر پایا جاتا ہے وہ عوام سے محبت کرتے ہیں اور خود کو ان میں سے ایک تصور کرتے ہیں۱؎ جوش بعض اوقات انقلابی موضوعات میں بھی جاگیردارانہ امتیاز کو زندہ رکھتے ہیں اور کبھی کبھی ہندستانی عوام کو "اے ہند کے ذلیل غلامان روسیاہ" بھی کہہ گئے ہیں اور کچھ اس انداز سے کہہ گئے ہیں گویا کہ خود ان کا "ان ذلیل غلامان روسیاہ" سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اگر تھا تو صرف اتنا کہ لعنتیں بھیجیں، کچھ سنائیں اور بس!

مجاز، جوش سے بہت قریب رہے ہیں ان کے انداز بیان پر بھی بعض اوقات جوش کے انداز بیان کے اثرات ملتے ہیں۔ جوش کے مزاج میں وہ جو ایک قسم کی بے باکی، بانکپن اور احساس برتری پایا جاتا ہے بہت ممکن ہے اس سے بھی مجاز متاثر ہوئے ہوں لیکن سب سے کم جس میدان میں ان پر جوش کا اثر پڑا ہے وہ ہے طرز فکر ہے اور دونوں شاعروں کے طرز فکر کا یہ اختلاف اتنا نمایاں اور جانا پہچانا ہے کہ اس کے ثبوت کے لئے مثالوں کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی۔

۱؎ "بہ ایں زندگی مجاز اک شاعر جو دہقاں ہے"

مجاز کا ادبی مرتبہ

مجاز کی شاعری کے شباب تک کے زمانہ کو جو ایک لحاظ سے ۱۹۴۵ء میں ختم ہو جاتا ہے ذہن میں رکھا جائے تو یہ بات بہ آسانی کہی جا سکتی ہے کہ جوش کے بعد اردو کی نئی نسل نے جو شاعر پیدا کیے مجاز ان سب سے اچھے اور بڑے شاعر تھے لیکن اس وقت سے اب تک اکیس بائیس برسوں میں ان کے بعض ہم عصروں مثلاً فیض احمد فیض، ن م راشد، اختر الایمان، مخدوم محی الدین اور سردار جعفری کے ادبی مرتبہ میں جیسا اور جتنا اضافہ ہوا ہے اس کو بھی مدنظر رکھا جائے تب بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بھی "انھیں شعرا کی طرح اس نسل کے اہم شاعر ہیں اور" ان کی صف میں مجاز کی جگہ دائیں یا بائیں نہیں بیچ میں ہے۔"[1] اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو فراموش نہ کیا جائے کہ مجاز نے جو کامیابی بارہ تیرہ برسوں (۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۵ء) کی شاعری

۱؎ مغنی آتش نفس از مجتبیٰ حسین (مجاز ایک آہنگ)

کے ذریعے حاصل کی اور جن بلندیوں پر پہونچے وہاں تک پہونچنے میں ان کے ہم عصروں کو اس سے دوگنی اور بعض کے سلسلے میں دوگنی سے زائد مدت لگی تو مجاز کی اہمیت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

اس مرحلہ پر بالکل فطری طور پر سوال اٹھتا ہے کہ مجاز نے اس مختصر مدت میں اردو شاعری کو ایسی کیا چیز دی جس کی بدولت انھیں یہ مقبولیت اور اہمیت حاصل ہوئی۔ ان کے انتقال کے موقع پر ممتاز حسین نے ان سے متعلق اپنے ایک مقالہ "حریفِ بحر ہوئی" کا خاتمہ ان الفاظ میں کیا تھا۔

"ہو نہ ہو آج اس کے غم میں ہم اس جھنڈے کو تو سرنگوں کرلیں جسے ہم ترقی پسندی کا پرچم کہتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک ترقی پسند شاعر تھا بلکہ اس لئے کہ اس پرچم کو اسی نے سب سے پہلے لہرایا تھا۔"[1]

ممتاز حسین کی یہ رائے صداقت پر مبنی ہوتے ہوئے بھی ادھوری ہے اس میں اضافہ کی ضرورت ہے اور وہ اضافہ یہ ہے کہ ترقی پسندی کے اس پرچم کو مجاز نے جس آن بان سے لہرایا وہ آن بان اب تک کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کو نصیب نہیں ہوئی اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک اب اردو میں پہلے کی طرح جاندار تحریک نہیں رہی لیکن جب بھی ان ہنگامہ خیز برسوں کے ادب کا جائزہ لیا جائے گا جن کے دوران آرزوؤں کی کشمکش اور جوش و تلاطم

---

[1] مجاز ایک آہنگ

کے خوابوں کی تعبیر میں تلاش کرنے کے لئے جوش اور پریم چند کے بعد کی اردو
کی نئی نسل نے ادب اور زندگی کی پرانی قدروں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے
ہوئے نئی اور پرخار وادیوں میں سفر کیا۔ مجاز کے شعری کارناموں کے آگے
بصد عقیدت سر جھکانا پڑے گا۔ ان کے عشق و جنون اور ان کی سادگی و
پرکاری اور بے خودی و ہشیاری کو خراج عقیدت پیش کرنا پڑے گا۔

اس میدان میں مجاز کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے
اردو میں ترقی پسند شاعری کی اقدار کی تشکیل میں حصہ لیا جبکہ ان کے
ہم عصروں، فیض، سردار جعفری اور مخدوم محی الدین وغیرہ نے ترقی پسند
شاعری کے اچھے نمونے اس وقت پیش کئے جبکہ یہ اقدار تشکیل پا چکی تھیں
انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے قبل علی گڑھ یونیورسٹی کے چند سرپھرے
نوجوانوں نے اپنی تحریروں سے انجمن کے قیام کے لئے ادبی طور پر فضا ہموار
کی ان میں اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری، اسرار الحق مجاز،
جاں نثار اختر ——— اور سبط حسن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اختر
رائے پوری نے اپنا مشہور مقالہ "ادب اور زندگی" لکھ کر اردو تنقید کو
ترقی پسندی کے ابتدائی نقوش سے روشناس کر دیا۔ حیات اللہ انصاری
نے اپنی کہانیوں سے حقیقت نگاری کے تصور کو ایک نیا موڑ دیا۔ مجاز نے
۱۹۳۳ء میں رات اور ریل، نذر خالدہ اور انقلاب جیسی نظمیں لکھیں
سبط حسن نے بعض ترجمے کئے اور آل احمد سرور نے علی گڑھ میگزین کے
اڈیٹر کی حیثیت سے میگزین میں ان باغی نوجوانوں کی ابتدائی تحریریں شائع

کیں۔ اس پورے ادبی حلقے میں مجاز کی جیسی اٹھان کسی دوسرے شاعر ادیب
کی نہ تھی۔ ادب اور زندگی کی نئی قدروں کا علم اٹھائے ہوئے یہ باغی شاعر
ایک عجیب کیف و مستی کے عالم میں حیرت انگیز فنی پختگی کے ساتھ عشق و جنوں
کے نغمے چھیڑے جھومتا گاتا نئی منزلوں کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس وادی
میں دوسرے لوگ بھی محو سفر تھے۔ دوسرے نغمے بھی گونج رہے تھے لیکن مجاز
کے بانکپن اور شان کج کلاہی میں کچھ ایسی کشش تھی کہ ساری نظریں انھیں
پر جم کر رہ گئی تھیں[1] وہ سنہ ۳۳ء سے سنہ ۳۷ء تک رات اور ریل اور انقلاب
کے بعد شوق گریزاں، تعارف، خانہ بدوش، نذر دل، مجبوریاں، نذر علی گڑھ
دلی سے واپسی، مسافر، اندھیری رات کا مسافر، طفلی کے خواب، نوجوان
سے، نوجوان خاتون سے، پردہ اور عصمت، آوارہ اور سرمایہ داری لکھ
چکے تھے۔ ان کی یہ نظمیں اردو کے اہم ادبی مرکزوں پر گونج رہی تھیں ان کے
ذریعے ترقی پسندی کے بنیادی تصورات اس زمانے میں عام ہو چکے تھے جبکہ
انجمن ترقی پسند مصنفین کو کسی بڑی ادبی تحریک کی حیثیت اختیار کرنے میں کافی
عرصہ باقی تھا۔ مجاز کو اس لحاظ سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ ان کا شعری مجموعہ
آہنگ پہلا ترقی پسند شعری مجموعہ تھا جو سنہ ۳۸ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ترقی پسند
اور جدید شاعری کے دوسرے دو اہم مجموعے "نقش فریادی" (فیض) اور
"ماورا" (ن۔ م۔ راشد) کافی بعد میں سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئے۔ اس طرح

---

[1] اس شخص (مجاز) نے سنہ ۳۶ء میں اپنی شاعری کی ایک ایسی ساکھ قائم کر لی تھی جو اس کے
ہم عصروں کو آج تک نہیں حاصل ہوئی۔ مجنوں گورکھپوری۔ (مجاز ایک آہنگ)

مجازؔ نے ترقی پسند شاعری کی اقدار کی تشکیل میں جو حصہ لیا اس کی بنا پر انھیں ترقی پسند ادب کی تحریک کی پیداوار نہیں بلکہ اس کا ایک اہم خالق کہنا (ہے) زیادہ مناسب ہوگا۔

مجازؔ کا دوسرا کارنامہ ترقی پسند خیالات اور نظریات کو شاعری میں کھپانے اور نبھانے سے ہے۔ انھوں نے ترقی پسندی کو خالی خولی سیاسی نعرے کی حیثیت سے نہیں قبول کیا تھا ترقی پسندی ان کے لئے ان کے عہد کے مخصوص مسائل اور حالات میں ایک حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ طرز زندگی اور طرز فکر کا نام تھی۔ انھوں نے نظریہ کو اپنے خون جگر سے رنگینی و رعنائی عطا کی اور اسے زندہ اور متحرک شکل میں شعر کا روپ دیا۔ ان کی چند نظموں کو چھوڑ کر جو وقتی اور ہنگامی ضروریات اور تقاضوں کے تحت لکھی گئیں۔ باقی تمام نظمیں موضوع اور فن کے نہایت ہی لطیف اور خوبصورت امتزاج کا نمونہ ہیں ان نظموں کی اہمیت محض اس لئے نہیں کہ یہ کسی خاص موضوع پر لکھی گئی ہیں یا کوئی خاص خیال ان میں نظم ہوا ہے بلکہ ان کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ان میں وہ خیال پورے شاعرانہ جلال و جمال کے ساتھ نظم ہوا ہے کوئی شعر روا روی میں نہیں لکھا گیا۔ کوئی نظم عام اور سطحی انداز میں نہیں کہی گئی۔ ہر شعر میں ' ہر نظم میں ایک ایک لفظ ' ایک ایک ترکیب ' ایک ایک مصرع دل سے نکالا ہے اور شعر یا نظم میں اس خوبصورتی ' نفاست اور خوش سلیقگی کے ساتھ جڑا ہوا ہے کہ اسے وہاں سے ہٹا کر اسی پائے کا کوئی لفظ ' کوئی ترکیب یا مصرعہ نہیں رکھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً

تمام نقاد اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ فن پر جتنا عبور مجاز کو حاصل ہے اتنا کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کو نہیں حاصل ہو سکا۔ آل احمد سرور نے ان کی انھیں فنی خوبیوں کی بنا پر کہا ہے کہ ان کے یہاں "کلاسیکل شعرا کی باوقار سادگی" ملتی ہے۔

اس معاملے میں مجاز کا یہ کارنامہ اس حقیقت کے مدنظر بہت وسیع ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ترقی پسند خیالات کو پورے فنی بناؤ سنگار کے ساتھ شعر کا جامہ پہنایا۔ ان سے متعلق جو شاندار روایت قائم کی اس کو آگے بڑھانا تو در کنار اسی شکل میں برقرار رکھنا بھی ممکن نہ ہو سکا۔ نظم میں فیض احمد فیض۔ احمد ندیم قاسمی اور بھی کسی حد تک ساحر لدھیانوی کے یہاں یہ روایت زندہ رہی اور غزل میں ان کے ہم عصر اور دوست جذبی اور بعد میں مجروح سلطانپوری اور غلام ربانی تاباں نے اسے اپنایا لیکن کچھ مشہور ترقی پسند شاعروں کی کھوکھلی سیاسی نعرہ بازی (کمیونسٹ پارٹی کی انتہا پسندانہ پالیسی کے زمانے میں خصوصاً) کے ہاتھوں ادب کو تو خیر کیا فائدہ پہنچتا اس سیاسی مقصد کو بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا جس کے نام پر منظوم تقریریں لکھی گئیں۔ مجاز کی قائم کی ہوئی روایت اسی شکل میں بھی زندہ رکھی جا سکتی تو ۱۹۵۲ء کے بعد نئی نسل میں ترقی پسندی کے خلاف جو شدید ردعمل ہوا شاید اس کے اندر اتنی زیادہ جارحیت نہ ہوتی۔ یہ مخالفانہ ردعمل دراصل کسی ترقی پسند نظریہ کے خلاف نہ تھا بلکہ ترقی پسندوں کے طویل سیاسی منظوم تقریروں کو اعلیٰ شاعری قرار دینے پر اصرار کے خلاف تھا۔

مجاز کی ترقی پسندی کا یہ پہلو بھی کچھ کم اہم نہیں کہ انھوں نے اسے صرف سیاسی موضوعات تک محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے جس موضوع کو بھی منتخب کیا اسے اسی آئینے میں دیکھا اور دکھایا۔ وہ صرف انقلاب، سرمایہ داری نوجوان سے، نوجوان خاتون سے وغیرہ نظمیں لکھتے وقت ہی ترقی پسند نہیں تھے۔ بلکہ رات اور ریل، نذر علی گڑھ، اور "ایک جلاوطن کی واپسی" لکھتے وقت بھی ترقی پسند تھے اور "آج کی رات" "نذر دل" مجبوریاں، اور آوارہ اور کس سے محبت ہے لکھتے وقت بھی ۔۔۔ محمد رضا انصاری فرنگی محلی[1] کو ایک خط میں انھوں نے ۱۹۴۳ء میں بمبئی کی ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں شرکت کا یقین دلاتے ہوئے ترقی پسندی سے اپنی وابستگی کے متعلق ن۔م راشد کی ان دنوں کی ایک مشہور نظم کا مصرعہ لکھا تھا۔

"کہ مرا عہد وفا ہے ابدی"

یہ عہد وفا ان کی زندگی کا جزو بن گیا تھا جس طرح مرتے دم تک کھدر استعمال کرتے رہے اسی طرح آخری نظم تک ان تصورات کو بھی کلیجے سے لگائے رہے جن سے شباب کے ولولوں کو دولت یقین ملی تھی۔

مجاز کی شاعری اپنے عہد اس کے مسائل اور خوابوں اور آرزوؤں کی ترجمانی کے سلسلے میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل کے برسوں میں ہندوستان میں سیاسی اور تہذیبی بیداری کی لہر نے جو خود اعتمادی پیدا کر دی تھی مجاز کی شاعری میں اس کی جھلکیاں بڑے نکھرے ہوئے انداز میں ملتی ہیں۔ ان کی شاعری میں وہ جو ایک خاص قسم کا "کچا پن" خیالات کے

[1] نقوش ۵۶-۵۵

سلسلے میں ملتا ہے وہ بھی دراصل اسی عبوری دور کی دین تھا جس میں خیالات اور قدریں زیر تشکیل تھیں اور خواب اور حقائق دونوں میں سے کوئی بھی قطعی اور واضح شکل نہیں اختیار کر سکے تھے۔ ان کے دور کی یہ خود اعتمادی کہیں "شہر یاروں سے رقابت کے جنون" کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کہیں انھیں "مرد انقلابی" کی حیثیت سے للکارتی ہے "دیہات کے شہر یاروں کو خبر دو۔ کہ مرد انقلابی آ گیا ہے" کبھی "زندانی گیسو جمیل" ہونے پر فخر کرتی ہے اور کہیں سرکش جوانی کے روپ میں اعلان کرتی ہے "وہ زندانی زلف پیچاں نہیں ہیں" کہیں "مرکب بزم دلبراں" بن کر مطمئن ہے اور کہیں لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بڑا ہوں" کے خواب دیکھتی ہے۔ کبھی مزدوروں کی آواز سے آواز ملا کر عوامی تحریکوں میں حصہ لیتی ہے اور کہیں علی گڑھ یونیورسٹی کی تہذیب [illegible] کا ترانہ گاتی ہے۔ کہیں اپنے دور کے کرب و اضطراب پر "اے غم دنیا یا گردہ" "اے وحشت دل کیا دن" کہتی ہوئی چیخ اٹھتی ہے اور کہیں انقلاب کی آمد کا مژدہ سناتی ہے۔ خود اعتمادی کے مختلف روپ میں کہیں کہیں یہ شاعر کی انا کی شکل بھی اختیار کرتی ہے لیکن ایسی جگہوں پر بھی یہ ذاتی انا یا شاعرانہ تعلی کم اور سماجی انا اور سماجی خود اعتمادی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح ان کا دور اپنے اضطراب، کرب، الجھن اور سیاسی اور سماجی بیداری کے ساتھ ان کے کلام میں سمٹ آیا ہے اور ان کی شاعری اس دور کی تہذیبی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہے۔

آخر میں مجاز کی شاعری کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے جو کم اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ ہے ان کا رجائی طرز فکر اور پر امید لب ولہجہ۔ انھوں نے جن حالات میں زندگی بسر کی ان میں ان کی شاعری قنوطیت کا شکار ہو کر رہ جاتی تو کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آخر ایسے حالات میں بھی وہ اس بانکپن کو اپنے آخری اشعار تک کس طرح برقرار رکھ سکے جو علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں انھیں ملا تھا۔ ان کی شاعری میں نشاط ہی کا ذکر نہیں ہے غم کی ترجمانی بھی ملتی ہے اور یہ غم اس نوعیت کا ہے کہ عام دل و جگر کے انسان کو پاگل کر دینے کے لئے کافی ہے لیکن اس غم کے معاملے میں بھی ان کا عام انداز بے فکری اور رجائیت کا ہے۔ اپنی آخری اہم نظم "فکر" میں انھوں نے خود اس کیفیت کی ترجمانی کی تھی۔

مٹ کے برباد جہاں ہو کے سبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کارفرما ہے کوئی تازہ جنون تعمیر
دل مضطر ابھی آمادۂ یاس نہیں

انھیں دنوں کی غزل کا ایک شعر تھا۔

بہ ایں سیل غم و سیل حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

سب کچھ کھو کے زیاں کا احساس نہ ہونا اور سر خم نہ ہونے دینا۔ معمولی بات نہیں ہے اور نہ ہر شاعر کو یہ دعویٰ زیبا دیتا ہے یہ بات کچھ مجاز ہی کو

زیب دیتی تھی اور وہی یہ دعویٰ بھی کر سکتے تھے اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے بالکل ٹھیک کہا ہے :۔

"بربادِ نگاریاں دل آرا اور رسوائے مے و مینا ہو کر مجاز کے اندر کا انسان اپنی فطری معصومیت، بے پناہ خلوص، والہانہ سرشاری اور عنفوانِ شباب کی سرمستی اور کھلاہی کو آخر دم تک برقرار رکھ سکا۔ اس کی مثال اس کے ہم عصروں میں شاید ہی مل سکے۔ حیاتِ جاوداں کی سعی ہر فن کار کا خواب طفلی ہے جس کی تعبیر کم خوش نصیبوں کے ہاتھ آتی ہے۔ شبابِ جاوداں صرف مجاز جیسے شہیدانِ محبت کے حصے میں آتا ہے" [1]

دوسری جنگِ عظیم کے دوران لکھنؤ میں "نیا ادب" [2] کے حلقہ کے دوستوں نے مجاز اور جذبی سے سیاسی نظمیں لکھنے پر اصرار کیا تھا۔ جذبی نے تو "اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ" لکھ دی تھی لیکن مجاز خاموش رہے پھر کچھ دنوں بعد اپنی مشہور نظم "آج بھی" لکھی جو ایک لحاظ سے ان تقاضوں اور اعتراضات کا جواب بھی تھا۔ جو ان دونوں شاعروں پر جنگ کے زمانے میں "غزل خوانی" کے سلسلے میں کئے جارہے تھے۔

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعرِ محفلِ وفا، مطربِ بزمِ دلبراں

---

[1] علی گڑھ میگزین مجاز نمبر

[2] یہ قصہ فرحت اللہ انصاری نے اپنے مضمون "مجاز جذبات میں چند باتیں" میں لکھا ہے

آج بھی گا رہا ہوں میں ساز جنوں لئے ہوئے
سوز تپاں سے آج بھی روح تپاں ہے دل تپاں

آج بھی ساز ہے مرے گرمیٔ بزم سرکشی
آج بھی آتش سخن شعلہ فشار و شرر فشاں

یہ نظم دراصل مجازؔ کے پورے شاعرانہ مزاج طرز فکر اور رجحانی لب و لہجہ کی بہترین ترجمان ہے یہ شباب جاوداں کا نغمہ ہے جو مرا نہیں کرتا۔

مجازؔ کا شعری سرمایہ زیادہ نہیں لیکن جو کچھ ہے اس کا خاصا بڑا حصہ ایسے ہی نغموں پر مشتمل ہے۔ یہ نغمے تیزی سے بدلتے ہوئے شعری مزاج کے ساتھ ساتھ پرانے ہوتے جارہے ہیں کچھ اس زمانے کے ہنگامی اور وقتی موضوعات سے متعلق ہیں جن میں کشش اور نیا پن باقی نہیں رہا۔ کچھ برسوں بعد یہ نغمے اور بھی پرانے ہو کر ماضی کا جزو بن جائیں گے لیکن جس طرح ماضی کے محل کی بہت سی آوازیں اب بھی ہمارے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں اسی طرح مجازؔ کی آواز بھی زندہ رہے گی اور ۱۹۳۵ء کے بعد کے شاعروں کا کوئی بھی تذکرہ ان کے نام کے بغیر مکمل نہ سمجھا جائے گا۔

جہاں تک موجودہ دور کا تعلق ہے فراقؔ گورکھپوری کی اس رائے سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔

"دور حاضر کی شاعری میں مجازؔ ایک عجیب و غریب مظہر

(Phenomena) کی حیثیت رکھتا ہے وہ ایک بان کی طرح چھوٹا اور فضا کی بلندیوں میں پھول سی جگمگاتی ہوئی چنگاریاں بکھیر کر چشمِ زدن میں بجھ گیا۔ لیکن یہ چنگاریاں اس کے مختصر مجموعہ کلام میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی ہیں ان کی جگمگاہٹیں زندگی کی راتوں کو روشن کرتی رہیں گی۔"[1]

11.10.67

---

[1] مجاز ۔ ایک آہنگ

مجاز کی منتخب نظمیں

آج کی رات

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات

اور کیا چاہیئے اب اے دلِ مجروح تجھے
اس نے دیکھا تو بہ اندازِ دگر آج کی رات

پھول کیا خار بھی ہیں آج گلستاں بہ کنار
سنگریزے ہیں نگاہوں میں گہر آج کی رات

محوِ گلگشت ہے یہ کون مرے دوش بدوش
کہکشاں بن گئی ہر راہ گزر آج کی رات

چھوٹ نکلا در و دیوار سے سیماب نشاط

اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات

شبنمستانِ تجلّی کا فسوں کیا کہیے

چاند نے پھینک دیا رختِ سفر آج کی رات

نور ہی نور ہے جس سمت اٹھاؤں آنکھیں

حسن ہی حسن ہے تاحد نظر آج کی رات

قصرِ گیتی میں امڈ آیا ہے طوفانِ حیات

موت لرزاں ہے پسِ پردۂ در آج کی رات

اللہ اللہ وہ پیشانیِ سیمیں کا جمال

رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات

عارضِ گرم پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں

وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات

نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

نغمہ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہیے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

میری ہر سانس پہ وہ ان کی توجہ کیا خوب
میری ہر بات پہ وہ جنبشِ سر آج کی رات

وہ تبسم ہی تبسم کا جمالِ پیہم
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

اف وہ وارفتگیِ شوق میں اک وہمِ لطیف
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پہ نظر آج کی رات

اپنی رفعت پہ جو نازاں ہیں تو نازاں ہی رہیں
کہہ دو انجم سے کہ دیکھیں نہ ادھر آج کی رات

ان کے الطاف کا اتنا ہی فسوں کافی ہے
کم ہے پہلے سے بہت دردِ جگر آج کی رات

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی

نیم شب کی خامشی میں زیر لب گاتی ہوئی

ڈگمگاتی، جھومتی سیٹی بجاتی کھیلتی

وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی

تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرود دلنشیں

آندھیوں میں مینھ برسنے کی صدا آتی ہوئی

جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت

ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی

نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں

نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی

ٹھوکریں کھا کر لچکتی، گنگناتی، جھومتی

سر خوشی میں گھنگھروؤں کی تال پر گاتی ہوئی

ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم

اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی

رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی کانپتی

پٹریوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی

جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات

شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی

منتشر کر کے فضا میں جا بجا چنگاریاں

دامن موج ہوا میں پھول برساتی ہوئی

تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بدم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی
سینۂ کہسار پہ چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے
رفعت کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی
رعشہ بر اندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی
یاد آجائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی

ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ

خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی

مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام

وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی

اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک

اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی

جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار

اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی

چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی

غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی

رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی

اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی

خود بخود روٹھی ہوئی بپھری ہوئی بکھری ہوئی

شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی

پل پہ دریا کے دمادم کوندتی للکارتی

اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی

پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں

ساحلوں پر ریت کے ذروں کو چمکاتی ہوئی

منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکایک دوڑ کر

دندناتی، چیختی، چنگھاڑتی، گاتی ہوئی

آگے آگے "جستجو آمیز" نظریں ڈالتی

شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی

ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی سمٹی ہوئی

ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی

تیزیٔ رفتار کے سکے جماتی جابجا
دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی
ڈال کر گزرے مناظر پہ اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی
صفحۂ دل سے مٹاتی عہد ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دل کش خواب کھلاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی
دامن تاریکیٔ شب کی اڑاتی دھجیاں
قصر ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی

زعم میں پیشانیٔ صحرا پہ ٹھوکر مارتی
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی
ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ درّاتی ہوئی
ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سینکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جاں فزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعر آتش نوا کا خون کھولاتی ہوئی

تعارف

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ الفت کا طلب گار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنہ عقل سے بیزار ہوں میں
خواب عشرت میں ہیں اربابِ خرد
اور اک شاعرِ بیدار ہوں میں
چھیڑتی ہے جسے مضرابِ الم
سازِ فطرت کا وہی تار ہوں میں

رنگِ نظارۂ قدرت مجھ سے
جانِ رنگینیٔ کہسار ہوں میں
نشۂ نرگسِ خوباں مجھ سے
غازۂ عارض و رخسار ہوں میں
عیب جو حافظ و خیام میں تھا
ہاں کچھ اس کا بھی گنہ گار ہوں میں
زندگی کیا ہے گناہ آدم
زندگی ہے تو گنہ گار ہوں میں
رشکِ صد ہوش ہے مستی میری
ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں
لے کے نکلا ہوں گہر ہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں

دیر و کعبہ میں مرے ہی چرچے
اور رسوا سر بازار ہوں میں

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے
اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

اہل دنیا کے لئے ننگ سہی
رونق انجمن یار ہوں میں

عین اس بے سروسامانی میں
کیا یہ کم ہے کہ گھر بار ہوں میں

میری باتوں میں مسیحائی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں

مجھ سے برہم ہے مزاج پیری
مجرم شوخیٔ گفتار ہوں میں

حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں
نوع انساں کا پرستار ہوں میں
محفل دہر پہ طاری ہے سکوت
اور وارفتۂ رفتار ہوں میں
اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

نذرِ دل

اپنے دل کو دونوں عالم سے اٹھا سکتا ہوں میں
کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھی بھلا سکتا ہوں میں

کون تم سے چھین سکتا ہے مجھے کیا وہم ہے
خود زلیخا سے بھی تو دامن بچا سکتا ہوں میں

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں

دفن کر سکتا ہوں سینے میں تمھارے راز کو
اور تم چاہو تو افسانہ بنا سکتا ہوں میں

میں قسم کھاتا ہوں اپنے نطق کے اعجاز کی
تم کو بزمِ ماہ و انجم میں بٹھا سکتا ہوں میں
سر پہ رکھ سکتا ہوں تاجِ کشورِ نورانیاں
محفلِ خورشید کو نیچا دکھا سکتا ہوں میں
میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں
تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لئے
گیت گا سکتا ہوں میں آنسو بہا سکتا ہوں میں
جذب ہے دل میں مرے دونوں جہاں کا سوز و ساز
بربطِ فطرت کا ہر نغمہ سنا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اٹھا سکتا ہوں میں

تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر
مجھ کو یہ دعوٰی کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں
آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

(سنہ ۳۶ء)

مجبوریاں

میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا
سکوں لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا
کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا
متاعِ سوز و سازِ زندگی پیمانہ و بربط
میں خود کو ان کھلونوں سے بھی اب بہلا نہیں سکتا
وہ بادل سر پہ چھائے ہیں کہ سر سے ہٹ نہیں سکتے
ملا ہے درد وہ دل کو کہ دل سے جا نہیں سکتا

ہوس کاری ہے جرم خودکشی میری شریعت میں
یہ حدِ آخری ہے میں یہاں تک جا نہیں سکتا

نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا

یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا

زباں پر بے خودی میں نام اس کا آ ہی جاتا ہے
اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے بتلا نہیں سکتا

کہاں تک قصۂ آلامِ فرقت مختصر یہ ہے
یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں جا نہیں سکتا

حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہونچا نہیں سکتا

(۱۹۳۶ء)

نذرِ علی گڑھ

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغرِ نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے

جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات ابلتی ہے

اسلام کے اس بت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی

یہاں حسن کی برق چمکتی ہے یاں نور کی بارش ہوتی ہے
ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے ہر اشک یہاں اک موتی ہے

ہر شام ہے شام مصر یہاں ہر شب ہے شب شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں

یہ دشت جنوں دیوانوں کا، یہ بزم وفا پروانوں کی
یہ شہر طرب رومانوں کا، یہ خلد بریں ارمانوں کی

فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں

اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی پروین سے رشتے جوڑے ہیں

اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں

اس بزم میں نیزے کھینچے ہیں اس بزم میں خنجر چومے ہیں
اس بزم میں گر گر تڑپے ہیں اس بزم میں پی کر جھومے ہیں
آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے
یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اتارے ہیں
ہر آہ ہے خود تاثیر یہاں ہر خواب ہے خود تعبیر یہاں
تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکست فاش یہاں
اس گل کدہ پارینہ میں پھر آگ بھڑکنے والی ہے
پھر ابر گرجنے والے ہیں پھر برق کڑکنے والی ہے

جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پہ برسے گا

ہر جوئے رواں پہ برسے گا ہر کوہ گراں پہ برسے گا

ہر سرو و سمن پہ برسے گا ہر دشت و دمن پہ برسے گا

خود اپنے چمن پر برسے گا غیروں کے چمن پہ برسے گا

ہر شہر طرب پہ گرجے گا ہر قصر طرب پہ کڑکے گا

یہ ابر ہمیشہ برسا ہے یہ ابر ہمیشہ برسے گا

(۳۶ء)

اندھیری رات کا مسافر

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں سے نور ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے اہرمن محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

غم و حرماں کی یورش ہے مصائب کی گھٹائیں ہیں
جنوں کی فتنہ خیزی حسن کی خونیں ادائیں ہیں
بڑی پرزور آندھی ہے بڑی کافر بلائیں ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گزشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

زمیں چیں بر جبیں ہے آسمان تخریب پر مائل
رفیقان سفر میں کوئی بسمل ہے کوئی گھائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں چٹانیں راہ میں حائل
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

افق پر زندگی کے لشکر ظلمت کا ڈیرا ہے
حوادث کے قیامت خیز طوفانوں نے گھیرا ہے
جہاں تک دیکھ سکتا ہوں اندھیرا ہی اندھیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

چراغ دیر، فانوس حرم، قندیل رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیازِ نورِ عرفانی
نہ ناقوسِ برہمن ہے، نہ آہنگِ حُدی خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

تلاطم خیز دریا، آگ کے میدان حائل ہیں
گرجتی آندھیاں، بپھرے ہوئے طوفان حائل ہیں
تباہی کے فرشتے، جبر کے شیطان حائل ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں شعلہ افشاں دیوِ استبداد کا خنجر
سیاست کی سنانیں اہلِ زر کے خونچکاں تیور
فریبِ بے خودی دیتے ہوئے بلور کے ساغر
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

بدی پر بارش لطف و کرم نیکی پہ تعزیریں
جوانی کے حسیں خوابوں کی ہیبت ناک تعبیریں
نکیلی تیز سنگینیں ہیں خوں آشام شمشیریں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

حکومت کے مظاہر جنگ کے پرہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل تازیانے بیڑیاں پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

افق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا کے آہنی وحشت اثر قدموں کی آہٹ ہے
دھوئیں کی بدلیاں ہیں گولیوں کی سنسناہٹ ہے
اجل کے قہقہے ہیں زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

(دسمبر ۳۷ء)

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے دل کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں، رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لیئے
اب بھی جانے کتنے دروانے ہیں وا میرے لیئے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لیئے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنیئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

(۳۷)

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکرِ حسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اس کی

وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے زہرہ جبیں ہے ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے میری زندگی ہے میری جنت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اس کی

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر افشانیاں اس کی

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اس دنیا میں اکثر اس قدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اس کی

جبیں پر سایہ گستر پرتوِ قندیلِ رہبانی
عذارِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی
قدم پر لوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سلیمانی
ازل سے معتقد ہے محفلِ نورانیاں اس کی

ادائیں لے کے آئی ہے وہ فطرت کے خزانوں سے
جگا سکتی ہے محفل کو نظر کے تازیانوں سے
وہ ملکہ ہے خراج اس نے لئے ہیں بوستانوں سے
بس اک میں نے ہی اکثر کی ہیں نافرمانیاں اس کی

وہ میری جرأتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہوس کی ظلمتوں پر نازکی بجلی گرا دینا
نگاہ شوق کی بے باکیوں پر مسکرا دینا
جنوں کو درس تمکیں دے گئیں نادانیاں اس کی

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اس نے گنگنایا ہے
سنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اس کی

مرے چہرے پہ جب کبھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اس کی

لب لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبیں نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اس کا تبسم اس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اس کی

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اس بارگاہ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اس کے جنوں کے زمزمے گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اس کی

خواب سحر

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پہ
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پہ
عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا
دل میں تاریکی، دماغوں میں اندھیرا ہی رہا
اک نہ اک مذہب کی سعی خام بھی ہوتی رہی
اہل دل پہ بارش الہام بھی ہوتی رہی
آسمانوں سے فرشتے بھی اترتے ہی رہے
نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے

ابنِ مریم بھی اٹھے، موسیٰ و عمران بھی اٹھے
رام و گوتم بھی اٹھے، فرعون و ہامان بھی اٹھے

اہلِ سیف اٹھتے رہے، اہلِ کتاب آتے رہے
ایں جناب آتے رہے اور آنجناب آتے رہے

حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی

مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے

آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگ زرگری جاری رہی
اہل باطن علم کے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتل عام
آدمی کب تک رہے اوہام باطل کا غلام
ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

(دسمبر ۳۹ء)

گریز

یہ جا کر کوئی بزم خوباں میں کہہ دے
کہ اب درخور بزم خوباں نہیں میں
مبارک تمھیں قصر و ایواں تمھارے
وہ دلدادۂ قصر و ایواں نہیں میں
جوانی بھی سرکش، محبت بھی سرکش
وہ زندانیٔ زلف پیچاں نہیں میں
تڑپ میری فطرت تڑپتا ہوں لیکن
وہ زخمیٔ پیکانِ مژگاں نہیں میں

دھڑکتا ہے دل اب بھی راتوں کو لیکن
وہ نوحہ گرِ دردِ ہجراں نہیں میں
بہ ایں تشنہ کامی، بہ ایں تلخ کامی
رہیں لب شکر افشاں نہیں میں
شراب و شبستاں کا مارا ہوں لیکن
وہ غرقِ شراب و شبستاں نہیں میں
قسم نطق کی شعلہ افشانیوں کی
کہ شاعر تو ہوں اب غزلخواں نہیں میں

(۱۹۴۶ء)

ایک غمگیں یاد

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فرازِ آسماں پر کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اٹھتی تھی اس کے چشمِ خنداں میں
خمستانِ فلک سے نور کی صہبا چھلکتی تھی

مرے بازو پہ جب وہ زلفِ شبگوں کھول دیتی تھی
زمانہ نکہتِ خلدِ بریں میں ڈوب جاتا تھا
مرے شانے پہ جب سر رکھ کے ٹھنڈی سانس لیتی تھی
مری دنیا میں سوز و ساز کا طوفان آتا تھا

وہ میرا شعر جب میری ہی لے میں گنگناتی تھی
مناظر جھومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا
مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب مسکراتی تھی
مرے ظلمت کدے کا ذرہ ذرہ جگمگاتا تھا

امنڈ آتے تھے جب اشک محبت اس کی پلکوں تک
ٹپکتی تھی در و دیوار سے شوخی تبسم کی
جب اس کے ہونٹ آجاتے تھے از خود میرے ہونٹوں تک
جھپک جاتی تھیں آنکھیں آسماں پر ماہ و انجم کی

وہ جب ہنگام رخصت دیکھتی تھی مجھ کو مڑ مڑ کر
تو خود فطرت کے دل میں محشر جذبات ہوتا تھا
وہ محو خواب جب ہوتی تھی اپنے نرم بستر پر
تو اس کے سر پہ مریم کا مقدس ہاتھ ہوتا تھا

شہرِ نگار

رخصت اے ہم سفرو شہر نگار آ ہی گیا
خلد بھی جس پہ ہو قرباں وہ دیار آ ہی گیا

یہ جنوں زار مرا میرے غزالوں کا جہاں
میرا نجد آ ہی گیا میرا تتار آ ہی گیا

آج بکھرا تا بہ چمن در پئے گلہائے چمن
گنگناتا ہوا زنبور بہار آ ہی گیا

گیسوؤں والوں میں ابرو کے کمانداروں میں
ایک صید آ ہی گیا ایک شکار آ ہی گیا

باغبانوں کو بتاؤ گل و نسریں سے کہو
اک خرابہ گل و نسریں بہار آ ہی گیا

خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگام سحر
اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آ ہی گیا

زلف کا ابر سیہ بازوئے سیمیں پہ لئے
پھر کوئی نغمہ زن ساز بہار آ ہی گیا

ہو گئی تشنہ لبی آج رہین کوثر
میرے لب پر لب لعلیں نگار آ ہی گیا

(۱۹۴۲ء)

عشرتِ تنہائی

میں کہ میخانۂ الفت کا پرانا میخوار
محفلِ حسن کا اک مطربِ شیریں گفتار
ماہ پاروں کا ہدف زہرہ جبینوں کا شکار
نغمہ پیرا و نوا سنج و غزل خواں ہوں میں

کتنے دل کش مرے بت خانۂ ایماں کے صنم
وہ کلیساؤں کے آہو وہ غزالانِ حرم
میں ہمہ شوق و محبت وہ ہمہ لطف و کرم
مرکزِ مرحمتِ محفلِ خوباں ہوں میں

موج زن ہے مۓ عشرت مرے پیمانوں میں
یاس کا درد ہے کم تر مرے افسانوں میں
کامرانی ہے پر افشاں مرے رومانوں میں
یاس کی سعی جنوں خیز پہ خنداں ہوں میں

میرے افکار میں مہتاب کی طلعت غلطاں
میری گفتار میں ہے صبح کی نزہت غلطاں
میرے اشعار میں ہے پھولوں کی نکہت غلطاں
روح گلزار ہوں میں جان گلستاں ہوں میں

لاکھ مجبور ہوں میں ذوق خود آرائی سے
دل ہے بیزار اب اس عشرت تنہائی سے
آنکھ مجبور نہیں ہے مری بینائی سے
محرم دردِ غم عالم انساں ہوں میں

کیوں نہ چاہوں کہ ہر اک ہاتھ میں پیمانہ ہو
یاس و محرومی و مجبوری اک افسانہ ہو
عام اب فیض مے و ساقی و میخانہ ہو
رند ہوں اور جگر گوشۂ رنداں ہوں میں

اب یہ ارمان کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور
اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

(سنہ ۴۳ء)

مادام

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لئے
لب پہ افسوں لئے آنکھوں میں مئے ناب لئے
ہر نفس رو میں لئے شورشِ طغیانِ نہاں
ہر نظرہ شوق کا افسانۂ بے تاب لئے
سحر و اعجاز لئے جنبشِ مژگانِ دراز
خندہ شوق جمال درخوشش آب لئے
ضوفگن روئے حسیں پر شبِ مہتابِ شباب
چشم مخمور نشاط شبِ مہتاب لئے

نشہ ناز جوانی میں سرشار اور ادا
جسم ذوقِ گہر و اطلس و کمخواب لئے
زلف شب رنگ لئے صندل و عود و عنبر
خم ابروئے حسیں دیر کی محراب لئے
لب گلرنگ و حسیں، جسم گداز و سیمیں
شوخیٔ برق لئے لرزشِ سیماب لئے
ایک عیادہ خوش اندام سواد مشرق
زلف بنگال لئے، طلعت پنجاب لئے
نزہت و ناز کا اک پیکر شاداب و حسیں
نکہت و نور کا امڈا ہوا سیلاب لئے
میری وارفتگیٔ شوق مسلّم، لیکن
کس کی آنکھیں ہیں زلیخا کا حسیں خواب لئے

آج بھی

میں ہوں مجازؔ آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعر محفل وفا، مطرب بزم دلبراں
آج بھی غار زار غم خلد بریں مرے لئے
آج بھی رہ گزار عشق میرے لئے ہے کہکشاں
آج بھی گا رہا ہوں میں ساز جنوں لئے ہوئے
سوز نہاں سے آج بھی روح تپاں ہے دل تپاں
آج بھی زندگی مری غرق شراب تند و تیز
آج بھی ہاتھ میں مرے جام شراب ارغواں

آج بھی ہے رچی ہوئی آج بھی ہے بسی ہوئی
میرے نفس میں خلد کی نزہت و نکہت جواں
آج بھی نکتہ چیں ہوں میں خلوتیاں خاص کا
خلوتیاں خاص کا آج بھی ہوں مزاج داں
آج بھی اشک خوں مرا قشقۂ جبین ناز کا
آج بھی خاک دل مری سرمۂ چشم گل رخاں
آج بھی ہے زباں مری خنجر بے نیام شوق
بحث طلب ہے آج بھی جرأت و شوخی بیاں
آج بھی دل کو ہے مرے دولت آگہی نصیب
آج بھی ہے نظر مری ارض و سما کی رازداں
آج بھی ہے جنوں مرا دیر و حرم پہ خندہ زن
آج بھی مجھ سے بدحواس دیر و حرم کے پاسباں

آج بھی ساز سے مرے گرمیٔ بزم سحر کشی

آج بھی آتش سخن شعلہ فشاں شرر فشاں

آج بھی ہے لکھی ہوئی سرخ حروف میں مجازؔ

دفترِ شہریار میں میرے جنوں کی داستاں

(دسمبر ۴۴ء)

اعتراف

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

میں نے مانا کہ تم اک پیکر رعنائی ہو

چمن دہر میں روح چمن آرائی ہو

طلعت مہر ہو فردوس کی برنائی ہو

بنت مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو

مجھ سے ملنے میں اب اندیشہ رسوائی ہے

میں نے خود اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے

شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے

شہر خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے

خواب گاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے

حسن نے جب کبھی عنایت کی نظر ڈالی ہے

میرے پیمان محبت نے سپر ڈالی ہے

ان دنوں مجھ پر قیامت کا جنوں طاری تھا

سر پہ سرشاری و عشرت کا جنوں طاری تھا

ماہ پاروں کی محبت کا جنوں طاری تھا

شہر یاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا

بستر مخمل و سنجاب تھی دنیا میری

ایک رنگین و حسیں خواب تھی دنیا میری

جنت شوق تھی بیگانۂ آفات سموم
درد جب درد نہ ہو کاوش درماں معلوم
خاک تھے دیدۂ بے باک میں گردوں کے نجوم
بزم پروین تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ہجوم

لیلیٔ ناز برافگندہ نقاب آتی تھی
اپنی آنکھوں میں لیے دعوت خواب آتی تھی

سنگ کو گوہر نایاب و گراں جانا تھا
دشت پرخار کو فردوس جواں جانا تھا
ریگ کو سلسلۂ آب رواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا

میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے راز غم و حسرت پنہاں

کیا سنوگی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریاد جگر دوز، مرا نالۂ زار
شدت کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاق طرب آگیں کا شکار
وہ گداز دل مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

مرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم تم مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو، میری محبت سے ڈرو
اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں
اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

۲۵ دسمبر

بتانِ حرم

کیا کہوں میں رات کس محفل میں تھا گرم نوا
نغمہ و نکہت کا وہ طوفان وہ ٹھنڈی ہوا
دیدنی تھا نازنینانِ تمدن کا ہجوم
بے حقیقت تھے نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم
ناز پروردہ حسیں، افکارِ غم سے بے نیاز
مہ جبینانِ حرم، قیدِ حرم سے بے نیاز
جن کی اک جنبش سے بنیادِ حرم میں ارتعاش
جن کی اک ٹھوکر سے زنجیرِ قدامت پاش پاش

بن گیا تھا یک بیک فردوسِ کیف و انبساط

یک دیرینہ کرم فرما کا ایوانِ نشاط

نرم صوفے گود میں فردوس برنائی لئے

زلف کے خم مرمریں شانوں کی برنائی لئے

وہ حسیں پیشانیاں، آئینۂ تمکینِ ناز

وہ رسیلی مدھ بھری آنکھیں وہ مژگانِ دراز

وہ سبک چاندی سے پیکر وہ جوانی کا نکھار

آذرِ فطرت کی صناعی کے زندہ شاہکار

رخ پہ شادابی، لبوں میں رس، تبسم برق پاش

چست پیراہن، نمایاں جسمِ سیمیں کی تراش

شوخ آنکھیں بادۂ گلگوں کے پیمانے لئے

گیسوئے شب رنگ پیچ و خم میں افسانے لئے

آہ وہ حسن مقابل وہ جمال ہم نشیں
دامن موج ہوا میں اک بہشت عنبریں
اک طرف سحر ملاحت، اک طرف افسون ناز
اک طرف زلف بریدہ، اک طرف زلف دراز
آنچلوں کی سرسراہٹ، زمزمے گاتی ہوئی
پیرہن سے نکہت خلد بریں آتی ہوئی
آہ وہ دوشیزہ لب، گلریز لب، گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب
وہ حجاب آگیں تکلم وہ رسیلے قہقہے
وہ نشاط آگیں تبسم، وہ سریلے قہقہے
قہقہے جن میں صبا کا راگ سیاروں کے گیت
نقرئی لے کی صدا، جنت کے مہ پاروں کے گیت

جامِ زریں کی کھنک سی قلقلِ مینا کے ساتھ

قدسیوں کی لے سرودِ بربطِ زہرا کے ساتھ

شوخیٔ لبِ نازفرما خندۂ بے باک پر

نور و موسیقی کی اک بارش سی فرشِ خاک پر

گفتگو کچھ اس سلیقے سے کچھ اس انداز سے

دل بچانا سخت مشکل تھا کمندِ ناز سے

وہ لچک سی جسمِ نازک میں خود اپنے بار سے

پھوٹ نکلی تھیں شعاعیں عارض و رخسار سے

وہ سمٹنے کی ادا طوفانِ رعنائی کے ساتھ

ذوقِ خود بینی، مذاقِ بزم آرائی کے ساتھ

عارضوں پر اک گلابی پن سا، ماتھوں پر دمک

انکھڑیوں میں اک سرورِ فتح مندی کی جھلک

بام و در پر اک تبسم سا، فضا گلرنگ تھی
جنبشِ مژگاں، دھڑکتے دل سے ہم آہنگ تھی

میرا نغمہ باعثِ دلداریِ خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہِ نشاطِ جاں تو ہے

(دسمبر ۴۶ء)

پہلا جشن آزادی

بہ صد غرور بہ صد فخر و ناز آزادی
مچل کے کھل گئی زلف دراز آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طراز آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح ساز آزادی
زمانہ رقص میں ہے زندگی غزلخواں ہے

ہر اک جبیں پہ ہے اک موج نور آزادی
ہر ایک آنکھ میں کیف و سرور آزادی
غلامی خاک بسر ہے حضور آزادی
ہر ایک قصر ہے اک بام طور آزادی
ہر ایک بام پہ اک پرچم درخشاں ہے

ہر ایک سمت نگارانِ یاسمیں پیکر
نکل پڑے ہیں در و بام سے مہ و اختر
وہ سیلِ نور ہے خیرہ ہے آدمی کی نظر
بہ صد غرور و ادا خندہ زن ہے گردوں پر
زمینِ ہند کہ جولاں گہِ غزالاں ہے

صدا دو انجم و افلاک رقص فرمائیں
بتانِ کافر و سفاک رقص فرمائیں
شریکِ محفلِ ادراک رقص فرمائیں
طرب کا وقت ہے بے باک رقص فرمائیں
کہ یہ بہار پیامیِ صد بہاراں ہے

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں

یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں

وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں

ابھی وہ سعیِ جنوں خیز کامیاب نہیں

یہ انتہا نہیں آغازِ کارِ مرداں ہے

دسمبر ۱۹۴۶ء

وطن آشوب

سبزہ و برگ و لالہ و سرو و سمن کو کیا ہوا
سارا چمن اداس ہے ہائے چمن کو کیا ہوا

ایک سکوت ہر طرف ہو تش ربا و ہولناک
خلد وطن کے پاسبان، خلد وطن کو کیا ہوا

رقص طرب کدھر گیا، نغمہ طراز کیا ہوئے
غمزہ و ناز کیا ہوئے عشوہ و فن کو کیا ہوا

جن کی نوائے دلستاں زخمہ ساز شوق تھی
کوئی بتا دے اس بت غنچہ دہن کا کیا ہوا

چشمک دم بدم نہیں مشقِ خرام و رم نہیں
میرے غزال کیا ہوئے میرے ختن کو کیا ہوا

چھائی ہے کیوں فسردگی عالمِ حسن و عشق پر
آج وہ نل کدھر گئے آج دمن کو کیا ہوا

آنکھوں میں خوف و یاس ہے چہرہ اداس اداس ہے
عصرِ رواں کی لیلیٰ برقعہ فگن کو کیا ہوا

آہ خرد کدھر گئی آہ جنوں نے کیا کیا
آہ شباب خوگرِ دار و رسن کو کیا ہوا

کوئی بتائے عظمتِ خاکِ وطن کہاں ہے اب
کوئی بتائے غیرتِ اہلِ وطن کو کیا ہوا

کوہ وہی دمن وہی دشت وہی چمن وہی
پھر یہ مجاز جذبۂ حبِّ وطن کو کیا ہوا

(دسمبر ۵۰ء)

نہیں ہر چند کسی گم شدہ جنت کی تلاش
اک نہ اک خلدِ طرب ناک کا ارماں ہے ضرور
بزمِ دوشینہ کی حسرت تو نہیں ہے مجھ کو
میری نظروں میں کوئی اور شبستاں ہے ضرور

مٹ کے برباد جہاں ہو کے سبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کارفرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دل مضطر ابھی آماجگہِ یاس نہیں

تازہ دم بھی ہوں، مگر پھر یہ تقاضا کیوں ہے
ہاتھ رکھ دے مرے ماتھے پہ کوئی زہرہ جبیں
ایک آغوشِ حسیں شوق کی معراج ہے کیا
کیا یہی ہے اثرِ نالہ و دلہائے حزیں

مہوشوں کا طرب انگیز تبسم کیا ہے
ہے تو سب کچھ یہ مگر خواب اثر کیوں ہو جائے
حسن کی جلوہ گہِ ناز کا افسونِ تسلیم
یہی قربان گہِ اہلِ نظر کیوں ہو جائے

میں نے سوچا تھا کہ دشوار ہے منزل اپنی
اک حسیں بازوئے سیمیں کا سہارا بھی تو ہو
دشتِ ظلمات سے آخر کو گزرنا ہے مجھے
کوئی رخشندہ و تابندہ ستارا بھی تو ہو

آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا

جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی

ٹوٹ جانا درِ زنداں کا تو دشوار نہ تھا

خود زلیخا ہی رفیقِ مہ کنعاں نہ بنی

یہ ایک انعامِ وفا اف یہ تقاضائے حیات

زندگی وقفِ غمِ خاکِ نشیناں کر دے

خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو

خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے

(سنہ ۱۹۵۰ء)

غزل

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکر بیش و کم نہیں ہے

ادھر مشکوک ہے میری صداقت
ادھر بھی بدگمانی کم نہیں ہے
مری بربادیوں کا ہم نشینوں
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے
ابھی بزم طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پرنم نہیں ہے
بہ ایں سیل غم و سیل حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے
مجازؔ اک بادہ کش تو ہے یقیناً
جو ہم سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے